الفاظِ طلاق کے اُصول
الفاظِ طلاق سے مُتعلقہ اُصولوں کی تفہیم و تشریح
تالیف
مفتی شعیب عالم
دارالافتاء جامعۃ العلوم الاسلامیۃ
علامہ بنوری ٹاؤن کراچی
ناشر
مکتبۃ اللسان کراچی
0321-2424628, 0333-3136744

الفاظِ طلاق کے اُصول

نام کتاب :.................................. الفاظ طلاق کے اصول

مصنف :.................................مفتی شعیب عالم

تعداد اشاعت :..............................1100

اشاعت :....................................دوم

سن اشاعت :..............................۱۴۳۸ھ ۲۰۱۷

ترتیب وتزئین:.............................کلیم اللہ(0315-2403140)

برائے رابطہ

عصر تا مغرب

0334-3316166

اسٹاکسٹ

ادارۃ الرشید

جامعہ علوم اسلامیہ علامہ محمد یوسف بنوری ٹاؤن کراچی

الفاظِ طلاق کے اُصول

(الفاظِ طلاق سے مُتعلقہ اُصولوں کی تفہیم و تشریح)

مُصنّف

مُفتی شعیب عالم

استاذ و مُعاون مفتی جامعۃ العلوم الاسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کراچی

مکتبۃ السّنان، کراچی

بسم الله الرحمن الرحیم

پیش لفظ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

یہ کتاب ان مضامین کا مجموعہ ہے جو ''ماہنامہ بینات'' میں محرم الحرام ۱۴۳۵ھ سے محرم الحرام ۱۴۳۶ھ تک گیارہ اقساط میں شائع ہوئے۔اب انہیں افادۂ عام کے لیے یکجا شائع کیا جارہا ہے۔اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اسے قارئین کے لیے مفید اور میرے لیے ذخیرۂ آخرت بنائے۔آمین

محمد شعیب عالم

۱۸ ذی الحجہ ۱۴۳۷ھ

تقریظ

حضرت مولانا ڈاکٹر عبدالرزاق اسکندر صاحب دامت برکاتھم
شیخ الحدیث ورئیس جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کراچی

الحمد لله رب العالمین، والصلاة والسلام علی سید الأنبیاء والمرسلین وعلی وآله وصحبه أجمعین۔

أما بعد:

نکاح زندگی بھر کے بندھن کا نام ہے، یہی بقائے انسانی کا حلال روحانی راستہ ہے، یہ محبتوں کا رشتہ ہے، جو ضابطوں کی بجائے رابطوں سے نبھاتے رہنا چاہیئے اور عام طور پر ایسا ہی ہوتا ہے، لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ انسان کی زندگی میں مختلف مشکلات اور دشواریاں بھی آتی رہتی ہیں، جنہیں اسلامی تعلیمات کی روشنی میں، مردانہ وار ہمت وحوصلہ سے سر کرنا ہوتا ہے، مگر کبھی انسانی ہمت، فطری ضعف کی نذر ہو جایا کرتی ہے، ایسے مشکل مرحلے میں بھی اگر اسلامی تعلیمات کا سہارا لیا جائے تو اسلامی تعلیمات کی روحانیت کی بدولت مسلمان، روحانی سکون اور نفسیاتی راحت سے ہم کنار رہتے ہوئے ان مشکل گھڑیوں میں سرخرو ہو جایا کرتا ہے۔

نکاح کا دائمی بندھن اگر اپنے حقوق وآداب کے ساتھ قائم نہ رہ سکے تو اسے قائم رکھنے کے لیے مختلف شرعی، اخلاقی اور معاشرتی ضوابط وروابط بروئے کار لانے کا حکم دیا گیا ہے، اگر جوڑ کی ساری تدابیر غیر مؤثر ہو کر رہ جائیں تو شریعتِ اسلامیہ نے

’’آخری حل‘‘ کے طور پر انتہائی ناگواری اور ناپسندیدگی کے ساتھ ’’أبغض الحلال‘‘ کہہ کر مرحلہ وار طلاق کا مختصر راستہ بھی کھلا چھوڑا ہے، تاکہ بوقتِ ضرورت ازدواجی مشکلات کو حل کرنے یا ایسی مشکلات سے نکلنے کے لیے یہ ’’طلاق‘‘ کا راستہ ایک ترتیب سے اختیار کرلیا جائے، مگر افسوس کہ اسلامی تعلیمات سے دوری اور بے تکی جذباتیت کے نتیجہ میں بعض مسلمان اس آخری حل کو اولین حل کے طور پر استعمال کرنے لگے ہیں، اس ضرورت کے راستے کو معمول کا راستہ بنانے لگے ہیں اور طلاق کو تنبیہ وتذکیر کی گنجائش کے باوجود آخری ہتھیار کے طور پر استعمال کرنے لگے ہیں۔ اس پر مزید طوفان اس صورت میں بپا ہوجاتا ہے جب ’’طلاق‘‘ کے لیے طلاق کے الفاظ کے چناؤ میں ایسی غلطی سرزد ہوجاتی ہے کہ جس کا تدارک عمر بھر کے پچھتاوے کے علاوہ کسی اور صورت میں ممکن نہیں رہتا، ایسے لوگ خود تو پریشان ہوتے ہی ہیں، ساتھ ساتھ اپنی پریشانی میں اندھے ہوکر طلاق کے الفاظ اور بیان میں گڈمڈ کرکے صورت مسئلہ کو بھی مشتبہ بنادیتے ہیں، جس سے مفتی صاحبان بھی پریشان ہوجاتے ہیں اور بیان کی غلطی، فتویٰ کی غلطی کا سبب بن جاتی ہے۔

ایسے ماحول میں اگر عوام الناس اپنی علمی، عملی اور جذباتی غلطیوں کی اصلاح پر توجہ نہ دیں اور اپنی غلطیوں سے باز نہ آئیں تو کم از کم اہلِ فتویٰ کو بھرپور تیقظ کی ضرورت ہے کہ وہ بھرپور تنقیح کے بعد صورت مسئلہ میں جہتِ حکم کی نبیاد متعین کریں، اس کے بعد طلاق کے لیے استعمال کردہ الفاظ میں غور کریں اور فقہائے کرام نے ان الفاظ کے احکام کے بیان کے لیے جن اصولوں کی رعایت کو لازمی قرار دیا ہے، ان کا پاس ولحاظ بھی رکھا جائے، تاکہ اہلِ فتویٰ، بیانِ حکم میں غلطی سے محفوظ رہ سکیں۔

اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے ہمارے دارالافتاء کے مستعد، باتوفیق اور باہمت رفیق، نوجوان فاضل مولانا مفتی شعیب عالم حفظہ اللہ کو، جنہوں نے بڑی محنت اور عرق ریزی سے اس گنجلک موضوع کو متعلقہ اصول کی روشنی میں اہلِ علم کے غور وفکر کے لیے منقح

ومرتب کرنے کی قابل قدر کوشش کی ہے، میرے سرسری مطالعہ کی روشنی میں یہ ''مجموعہ'' مندرجہ ذیل خصائص وامتیازات سے آراستہ ہے:

صریح وکنایہ کی متعلقہ تفصیل کے علاوہ ایک دوسرے کے موقع پر استعمال کی نشان دہی

قرائن ودلالتِ حال کے سلبی وایجابی اثرات کی وضاحت

متعلقہ فقہی مباحث کو مختلف صورتوں اور فوائد کی روشنی میں سمجھانا

قضاو دیانت کے اثرات اور نتیجتاً حکم کا فرق ظاہر کرنا

زیر بحث لائے گئے مسائل کو صریح وتائیدی حوالہ جات سے آراستہ کرنا

اخذ ومراجعت میں ٹھوس دلائل، مضبوط مأخذ اور اکابر کے محاکمات وآرا کی روشنی میں موضوع کی تفہیم کی کوشش کرنا

الغرض کسی بھی موضوع پر خامہ فرسائی کے لیے جو بنیادی تقاضے ہو سکتے ہیں، وہ اس مجموعے میں مجھے جا بجا محسوس ہوئے ہیں۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اس علمی کاوش کو قبول فرمائے، عزیزم مفتی شعیب عالم سلمہ کی علمی وقلمی صلاحیتوں میں ترقی وجلاء نصیب فرمائے اور عوام وخواص کو اس علمی وتحقیقی کاوش سے نفع پہنچائے، آمین!

وصلی اللہ وسلم علی سیدنا محمد وعلی آلہ وصحبہ أجمعین۔

والسلام

(مولانا ڈاکٹر) عبدالرزاق اسکندر (مدظلہ)

مہتمم جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کراچی

مقدمہ

طلاق کے الفاظ کا فہم اور ضبط مشکل معلوم ہوتا ہے اور اس پر مبنی مسائل کے سمجھنے میں دِقّت پیش آتی ہے۔ اس مشکل کی وجوہات ایک سے زیادہ ہیں۔ بڑی وجہ تو ہمارے فہم کا قصور، ذوق کا فقدان اور طلب کی کمی ہے، ورنہ مشکلے نیست کہ آسان نشود۔ فقہاء کرام تو پوری امت کی طرف سے خصوصی شکریے کے مستحق ہیں کہ انہوں نے ایک ایسا عظیم ذخیرہ یادگار چھوڑا ہے جو تمام قانونی ذخیروں پر فائق ہے اور اس کی وجہ سے اہل اسلام کے سر فخر سے بلند ہیں، مگر یہ ذخیرہ مراجعت و مزاولت چاہتا ہے، جب کہ اوقات میں برکت ہے، نہ مشاغل سے فرصت، ذوق وشوق کا فقدان اس کے علاوہ ہے اور فہم کا قصور اس پر مستزاد۔

الفاظ سے متعلق مسائل میں مشکل کی ایک وجہ خود ان الفاظ کی کثرت بلکہ بہتات ہے، جس میں بجائے کمی کے اضافہ ہو رہا ہے، پرانے الفاظ محفوظ ہو رہے ہیں اور نئے الفاظ کا ان میں اضافہ ہو رہا ہے۔ کتبِ فتاویٰ میں کنایات کی تعداد کے متعلق پچپن سے زائد (نیف و خمسة و خمسین) کا اجمالی عدد مذکور ہے۔ جب اس مجمل عدد اور مبہم تعداد کی تعیین کی کوشش کی گئی تو تعداد دو سو کے لگ بھگ معلوم ہوئی اور یہ تعداد بھی

حتمی اور آخری نہیں، بلکہ تلاش اور جستجو سے اس میں مزید اضافہ ممکن ہے۔ فقہاء ہر باب کے آغاز میں اس باب کے موضوع کے متعلق خاص الفاظ اور مخصوص تعبیرات ذکر کرتے ہیں، مگر الفاظ کی اتنی بڑی تعداد کتاب الطلاق کے علاوہ کسی باب میں مذکور نہیں ہے۔

جو الفاظ متداول اور مشہور و معروف ہیں اور طلاق کے مقصد کے لیے ان کا استعمال عام ہے، جنہیں فقہ کی زبان میں صریح کہتے ہیں، ان کی تعداد کنایات کے علاوہ ہے۔ صریح کا فہم و ضبط سہل سمجھا جاتا ہے اور بے کھٹکے اس کے حکم کا بیان آسان معلوم ہوتا ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ آسان وہ بھی نہیں۔ ایک صاف اور سادہ جملہ اس وقت پیچیدہ اور گنجلک بن جاتا ہے، جب شوہر تعبیر بدل کر اس کا استعمال کرتا ہے۔ ایک صفت کے بڑھانے یا صریح کے آگے پیچھے کوئی جملہ استعمال کرنے سے اس کی نوعیت عموماً بدل جاتی ہے۔ اگر نوعیت کلی طور پر تبدیل نہ ہو تو مسئلہ آسان سے مشکل اور سرسری نظر کی بجائے گہری فکر کا متقاضی ضرور بن جاتا ہے۔ یہ الجھن اس وقت شدت اختیار کر جاتی ہے، جب صریح کے بعد والا لفظ یا جملہ تفسیر، خبر اور انشاء کے مساوی احتمالات رکھتا ہو۔

پھر صریح الفاظ صراحت میں بھی مساوی درجے کے نہیں ہیں، بلکہ منطقیوں کے ہاں کا کلی مشکک معلوم ہوتے ہیں۔ کچھ صریح ہیں تو کچھ اُصرحُ صریحٍ۔ کچھ میں ایسے قرینے کی عدم موجودگی ضروری ہے جو طلاق کے وقوع پر دلالت کرتا ہو۔ کچھ صریح ایسے بھی ہیں جو اپنی اصل وضع کے اعتبار سے کنایہ ہیں، مگر اب صریح کے مقام پر آگئے ہیں۔ اس نوع کے الفاظ میں تنازع یہ ہے کہ یہ ہر ہر حیثیت سے صریح کے حکم میں ہیں یا فقط نیت کی احتیاج نہیں رکھتے ہیں۔

اس تفصیل سے ظاہر ہے کہ صریح بھی کئی انواع پر ہیں اور جب ایسا ہے تو صریح

کے حکم کے بیان سے قبل اس کی نوعیت کا تعین ضروری ہے، مگر صریح کی نوعیت متعین کرنے سے پہلے خود صریح کو صریح قرار دینے کا مرحلہ پیش آتا ہے۔ اصولیوں کے ہاں جس لفظ کا معنی صاف اور واضح ہے وہ صریح ہے، مگر فقہاء کا معیار دوسرا ہے۔ یہاں کسوٹی لفظ کا کثرت سے طلاق کے لیے استعمال یا عدم استعمال ہے۔ استعمال اور عدم استعمال کا علم عام لوگوں کی بول چال اور محاورے سے ہوتا ہے، اس طرح عرف کے کوچہ و بازار کی طرف بحث کا رخ مڑ جاتا ہے۔ عرف کی گلیوں میں پھریں اور بازاروں کی سیر کریں تو ایسا کارخانہ معلوم ہوتا ہے، جہاں نئے نئے الفاظ ڈھل ڈھل کر نکلتے ہیں اور پرانے متروک اور فنا ہوتے جاتے ہیں۔ استعارے کی زبان چھوڑیں تو عرف ہی الفاظ وضع کرتا ہے، وہی ایک لفظ کو صریح اور دوسرے کو کنایہ قرار دیتا ہے اور یہی عرف ہے جو صریح کو کنایہ اور کنایہ کو صریح بنا دیتا ہے۔

انسان خود بھی کسی نہ کسی عرف کا حصہ ہوتا ہے اور عرف کی تشکیل میں اس کا شعوری یا غیر شعوری دخل ہوتا ہے، مگر شریک اور سہیم ہونے اور برسوں اس مکان کا مکین رہنے کے باوجود اپنے ہی عرف سے مبصرانہ اور ناقدانہ واقفیت کوئی ضروری نہیں ہے، اس کی وجہ عرف کی ساخت میں موجود تنوع اور لچک ہے۔ یہ نئے رنگوں میں رنگتا ہے اور جدید سانچوں میں ڈھلتا ہے۔ اس کی طبیعت میں سختی کی بجائے لچک، مزاج میں سکون اور قرار کی بجائے حرکت اور تغیر اور فطرت میں یک رنگی کی بجائے دو رنگی ہے۔

ہر قوم اور برادری کے ہاں عرف کا رنگ مختلف ہوتا ہے اور ایک ہی برادری کا عرف زمان و مکان کی تبدیلی سے بدلتا رہتا ہے اور جب خود بدلتا ہے تو زبان میں بھی تبدیلی لاتا ہے اور الفاظ کے مزاج اور معانی کی طبیعت پر اثر چھوڑ جاتا ہے۔ اردو زبان

کو دیکھ لیں! کتنے الفاظ ایسے ہیں جو کسی زمانے میں بہت معصوم اور بے ضرر سمجھے جاتے تھے، مگر اب انتہائی زہریلے اور کاٹ دار محسوس ہوتے ہیں۔ طلاق کے معاملے میں بھی بہت سے الفاظ کنائی بائن تھے، مگر اب رجعی ہیں اور کچھ صریح ہیں، مگر پھر بھی ان سے بائن ہی واقع ہوتی ہے، حالانکہ صریح کے عام قاعدے کے مطابق ان سے رجعی واقع ہونی چاہیے تھی۔ وجہ وہی عرف کی تبدیلی ہے، جس نے معنی میں شدت پیدا کر دی ہے اور یہی شدت وخفت طلاق کے حکم اور نتیجے پر اثر انداز ہوتی ہے۔

طلاق کسی سوچے سمجھے منصوبے کے تحت نہیں، بلکہ عموماً جذبات کی بے اعتدالی کی صورت میں دی جاتی ہے۔ اس صورت میں شوہر سے کسی علمی اسلوب کی توقع فضول ہے۔ اُس کی گفتگو میں طلاق اور غیر طلاق کے الفاظ رلے ملے اور ملے جلے ہوتے ہیں اور وہ کھچڑی سی بنا کر مفتی کے سامنے پیش کر دیتا ہے۔ اس کھچڑی میں ماضی، حال اور استقبال کے صیغے بھی شامل ہوتے ہیں اور شوہر نے اُسے تاکید اور تکرار کا تڑکا بھی لگایا ہوتا ہے۔ اب مفتی کا یہ فریضہ بنتا ہے کہ وہ تاکید یا تکرار کا تعین کرے، مضارع سے موجودہ یا آئندہ کون سا زمانہ مراد ہے؟ اس کا فیصلہ کرے، نیت کی ضرورت ہو تو دریافت کرے، سیاق وسباق پر نظر رکھے اور قرائن پر مدار ہو تو انہیں زیر غور لائے، اور اس کے بعد طلاق کے عدد کا تعین کرے کہ مجموعی طور پر کتنی طلاقیں واقع ہوئی ہیں۔

طلاق کے عدد کے بیان کے وقت ایک تو لحوق اور عدم لحوق کا مسئلہ سامنے آتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ایک طلاق کے بعد دوسری اور تیسری طلاق واقع ہوئی ہے یا نہیں؟ یہ فیصلہ اسی وقت بصیرت کے ساتھ کیا جا سکتا ہے جب طلاق کی سولہ صورتوں کا علم ہو اور یہ بھی معلوم ہو کہ کس صورت میں دوسری طلاق پہلی طلاق کے ساتھ ملحق ہوتی ہے۔

اس موقع پر دوسرا قضیہ یہ حل کرنا ہوتا ہے کہ طلاق کی نوعیت کیا ہے؟ آیا طلاق بائن واقع ہوئی اور نکاح ختم ہوگیا ہے یا رجعی پڑی ہے اور نکاح برقرار ہے؟ اس امر کا فیصلہ صرف لفظ کے صریح یا کنایہ ہونے کی بنا پر نہیں کیا جاسکتا، کیوں کہ صریح سے بائن بھی واقع ہوتی ہے اور کنایات سے رجعی بھی پڑتی ہے۔اس کے علاوہ آٹھ دس صورتیں ایسی بھی ہیں جن میں طلاقِ رجعی سے طلاق بائن واقع ہوجاتی ہے۔

اگر مشکلات صرف اس قدر ہوتیں جس قدر بیان ہوئیں تو بھی کچھ زیادہ نہ تھیں، مگر اصل دِقّت وصعوبت کنایات کے حل کرنے میں پیش آتی ہے۔کنایات کا بیان طویل، مسائل غامض اور فہم مشکل تر ہے اور ان ہی سے فقہاء کے دِقّت فہم اور قوتِ فکر کا صحیح اندازہ ہوتا ہے۔گنتی میں کنایات کی تعداد زیادہ ہے، مگر تشریح کے ان سخت اور کڑے اصولوں کے پیش نظر جو فقہاء نے کنایات کی تعبیر وتشریح کے لیے مقرر کیے ہیں، کنایہ سے طلاق کے وقوع کا امکان بہت کم رہتا ہے۔مزید یہ کہ کنایات میں مفتی کے دخل کو بھی شریعت نے محدود ہی رکھا ہے۔اہل علم بخوبی جانتے ہیں کہ کنایہ سے طلاق کا وقوع نیت یا دلالتِ حال پر موقوف ہوتا ہے۔اگر نیت نہ ہوتو دلالتِ حال سے نیت کو برآمد کرنا پڑتا ہے۔نیت تو شوہر کا داخلی جذبہ اور قلبی فعل ہے، اس لیے اس کا اظہار شوہر کے بیان پر موقوف ہے، اور اس کے کہے کا اعتبار ہوتا ہے، کیوں کہ وہ اپنے بیان میں امین سمجھا جاتا ہے، جب کہ دلالتِ حال پر فیصلہ اصل میں مفتی کا نہیں، بلکہ قاضی کا منصب ہے۔اگر اس اصل کو دیکھا جائے تو مفتی کا دخل کنایات میں کم رہ جاتا ہے، مگر چند وجوہات ایسی ہیں، جن کا بیان اپنے مقام پر آئے گا کہ اب مفتی نے قضا کی سرحدوں میں قدم رکھ دیا ہے۔

اصل مقصود افتا اور قضا کی سرحدوں کا تعین نہیں، بلکہ کنایات کی مشکلات کا بیان ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کنایات کا فہم فی نفسہٖ بھی مشکل ہے، کیوں کہ اس کا مدار زبان اور محاورے پر ہے اور زبان پر گرفت ایک مدت بعد حاصل ہوتی ہے اور محاورے کا فہم آتے آتے آتا ہے۔ اس کے علاوہ کنایات میں قرائن کو بھی زیرِ غور لانا پڑتا ہے اور حسی و معنوی شواہد پر بھی نظر رکھنا پڑتی ہے۔

یہ وہ وجوہات ہیں، جن کی بنا پر طلاق کے الفاظ کے متعلق مسائل کو حل کرنے میں دِقّت پیش آتی ہے۔ ان مشکلات کے حل کی تدبیر یہ معلوم ہوئی کہ جن اصولوں پر الفاظ کے متعلق احکام مبنی ہیں، اُنھیں یکجا کر کے ان کی تشریح کر دی جائے، مگر یہ اصول کسی ایک جگہ منقح شکل، منضبط صورت اور مرتب انداز میں دستیاب نہیں تھے۔ راقم نے ان کو اپنے فہم کے مطابق مرتب کرنے کی کوشش کی ہے۔ زیرِ نظر تحریر ان ہی اصولوں کے بیان پر مشتمل ہے۔ ان اصولوں کو اصطلاحی معنی میں اصول کہنا بھی شاید بے اُصولی ہو، تاہم اتنا ضرور ہے کہ ان کی رعایت سے الفاظ کے متعلق احکام کا ضبط اور فہم آسان ہو جاتا ہے اور وہ ایک اصل پر مبنی، قاعدے کے تحت داخل، معنوی طور پر مربوط اور علت سے معلول معلوم ہونے لگتے ہیں۔ آگے ان ہی اصولوں کا بیان ہے، جنھیں فوائد سے تعبیر کیا گیا ہے۔

اگر آپ گزشتہ سطور میں بیان کی گئی مشکلات میں سے کوئی مشکل محسوس کرتے ہیں اور اس کے حل میں دل چسپی رکھتے ہیں تو اس تحریر کا مطالعہ آپ کے لیے فائدے کا باعث ہوگا۔ یہ کہنا تو مبالغہ آرائی ہوگا کہ اس مضمون کے مطالعے سے وہ مشکلات ختم ہو جائیں گی، البتہ یہ عرض کرنا بے جا اور خلافِ حقیقت نہ ہوگا کہ وہ کچھ آسان ضرور ہو جائیں گی۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ یہ سلسلہ مفید ثابت ہو، آمین۔ وماذٰلک علی اللہ بعزیز.

فائدہ ۱

طلاق لفظ سے ہوتی ہے۔

پہلا فائدہ

طلاق لفظ سے ہوتی ہے

طلاق کا تعلق زبان سے ہے، جب تک زبان سے کوئی لفظ نہ نکلے، طلاق نہیں ہوتی ہے۔

لفظ ''اس آواز کو کہتے ہیں جو انسان کے منہ سے حروف کی صورت میں نکلتی ہے'':

''الصوت المشتمل علی بعض الحروف تحقیقًا أو تقدیرًا'' [1]

ترجمہ: ''ایسی آواز جو حقیقی یا تقدیری طور پر کچھ حروف پر مشتمل ہو''۔

اس تعریف سے معلوم ہوا کہ لفظ کی حقیقت اور اس کے بنیادی عناصر دو ہیں:

(۱)......آواز

(۲)......حروف

منہ سے طرح طرح کی آوازیں نکلیں، مگر حروف پیدا نہ ہوں تو وہ آواز تو ہے مگر

---

[1] أوضح المسالک إلی الفیة ابن مالک، باب شرح الکلام، ج ۱/۳۳ ط: دار الکتب العلمیة، الطبعة الأولی ۱۴۱۸ھ

لفظ نہیں ہے۔فقہ میں اس کے لیے"صوت لا ھجاء له"(آواز بلا حروف) کی تعبیر استعمال کی جاتی ہے۔صرف"آواز" لفظ نہیں، اور لفظ نہ ہو تو طلاق نہیں ہوتی، اس لیے صرف آواز سے طلاق نہیں ہوتی:

"ورکنه لفظ مخصوص"[1]

ترجمہ:"طلاق کا رکن خاص لفظ ہے"۔

آواز اور حروف کے ساتھ یہ بھی شرط ہے کہ وہ انسان کی زبان سے نکلیں، ورنہ بولنے کو تو جانور بھی بول لیتے ہیں، چڑیاں"چوں چوں" اور کوا"کائیں کائیں" کرتا ہے۔نہ صرف بولتے ہیں، بلکہ پڑھاؤ تو پڑھتے بھی ہیں، مگر اسے لفظ کہتے ہیں، نہ زبان، کیوں کہ جانور معدودے چند الفاظ کے زیادہ نہیں بول سکتے، نہ ہی انسان کی طرح مسلسل گفتگو کر سکتے ہیں اور نہ ہر طرح کے ادائے مطالب پر قادر ہوتے ہیں، اس لیے جانور کی بولی کو"لفظ" نہیں کہتے ہیں۔

"لفظ" کی اس مختصر وضاحت کے بعد طلاق کے ایسے بہت سے مسائل کا سمجھنا آسان ہے، جن کا تعلق لفظ کے ساتھ ہے، بطور نمونہ چند درج کیے جاتے ہیں:

مسئلہ:......(۱) دل ہی دل میں طلاق دینے یا بار بار طلاق کا خیال آنے سے طلاق نہیں ہوتی ہے، اگرچہ خیال کتنا ہی شدید کیوں نہ ہو، کیوں کہ طلاق کا تعلق"لفظ" کے ساتھ ہے اور"لفظ" کے لیے منہ سے آواز کا نکلنا اور حروف کا بننا شرط ہے۔جو شخص دل ہی دل میں طلاق دیتا ہے وہ طلاق دیتا نہیں، بلکہ طلاق سوچتا ہے، جب کہ سوچنے سے طلاق نہیں ہوتی، بلکہ دینے سے واقع ہوتی ہے:

---

[1] الدر المختار مع رد المحتار، کتاب الطلاق، ۲۳۰/۳، ط:سعید

"فرکن الطلاق ھو اللفظ الذی جعل دلالةً علی معنی الطلاق لغةً"۔[1]

ترجمہ: "طلاق کا رکن ایسا لفظ ہے جو لغوی طور پر طلاق کے معنی پر دلالت کرتا ہو"۔

"... لو أجریٰ الطلاق علی قلبه وحرک لسانه من غیر تلفظ یسمع لا یقع وإن صحح الحروف"۔[2]

ترجمہ: "اگر دل میں طلاق کا خیال لایا اور زبان اس طرح ہلائی کہ کوئی سننے کے قابل لفظ زبان سے نہیں نکلا تو طلاق واقع نہ ہوگی، اگرچہ حروف درست ادا کیے ہوں"۔

مسئلہ:......(۲) طلاق کے لیے منہ سے آواز کا نکلنا شرط ہے، مگر اس آواز کی بھی حد مقرر ہے کہ وہ ایک خاص حد تک اونچی ہو، بہت پست اور نیچی نہ ہو، اس بارے میں کم از کم حد یہ ہے کہ آواز اتنی اونچی ہو کہ اُسے خود سن سکے، لہٰذا اگر ہونٹوں کو خفیف سی حرکت اور زبان کو معمولی سی جنبش ہوئی، مگر آواز نکلی ہی نہیں یا آواز تو نکلی مگر اس قابل نہ تھی کہ اسے خود سنائی دیتی تو طلاق واقع نہیں ہوگی، البتہ اگر آواز سنائی دینے کے قابل تھی مگر کسی سبب سے سن نہ سکا، مثلاً: ٹریفک کا شور تھا یا بادل گرج رہے تھے یا بارش برس رہی تھی یا لوگ اونچی آواز سے بول رہے تھے یا خود شوہر کانوں کا بھاری تھا اور اپنی آواز سن نہ سکا تو طلاق واقع ہو جائے گی:

"أدنی الجهر إسماع غیره، وأدنی المخافتة إسماع نفسه ومن بقربه...ویجری ذالک فی کل مایتعلق بنطق کتسمیة علی ذبیحة، ووجوب سجدة تلاوة وعتاق وطلاق واستثناء وغیرها، فلو طلق واستثنی ولم یسمع نفسه لم یصح فی الأصح"۔[3]

---

[1] مراقي الفلاح شرح نور الإيضاح، كتاب الصلاة، باب شروط الصلاة وأركانها، ص: ۱۴۴، ط: میر محمد

[2] بدائع الصنائع، كتاب الطلاق، فصل في ركن الطلاق، ۲۳۰/۳، ط: سعید

[3] مراقي الفلاح شرح نور الإيضاح، كتاب الصلاة، باب شروط الصلاة وأركانها، ص: ۱۴۴، ط: میر محمد

ترجمہ: ''جہر کی کم از کم حد یہ ہے کہ دوسرے کو سنا دے، اور اخفاء کی ادنیٰ مقدار یہ ہے کہ خود اور پاس والے کو سنا دے۔ یہ ضابطہ ہر ایسے مقام کے لیے ہے جس کا تعلق نطق سے ہے، جیسے ذبیحہ پر تسمیہ، سجدۂ تلاوت کا وجوب،، طلاق وعتاق اور استثناء وغیرہ، لہٰذا اگر طلاق دی اور استثناء کیا اور خود کو سنائی نہ دیا تو اصح مذہب پر استثناء صحیح نہ ہوگا''۔

"... لأن الحد الذی توجد فیه القراءة عنده خروج صوت یصل إلی أذنه أی ولو حکما کما لو کان هناک مانع من صمم أو حلبة أصوات أو نحو ذلک، وهذا معنی قوله: أدنی المخافتة إسماع نفسه"۔ [1]

مسئلہ:......(۳) پرندے کو تعلیم دی اور اس نے طلاق بول دی تو اس کے بولنے سے یا ریکارڈ شدہ آواز کے سننے سے یا اصل آواز کی بازگشت سننے سے بھی طلاق نہ ہوگی۔

مسئلہ:......(۴) شوہر کچھ کہے بغیر بیوی کو گھر سے نکال دیتا ہے یا غصے میں اُسے میکے چھوڑ آتا ہے یا اس کا سامان بھجوا دیتا ہے، مگر زبان سے کچھ نہیں کہتا تو طلاق واقع نہیں ہوتی، اسی طرح طویل عرصے تک میاں بیوی ایک دوسرے سے جدا رہیں تو بھی طلاق واقع نہیں ہوتی۔

علاوہ ازیں کوئی فعل خواہ کتنا ہی قبیح کیوں نہ ہو اور کوئی حرکت کتنی ہی سنگین کیوں نہ ہو، اس سے طلاق واقع نہ ہوگی، مثلاً شوہر کے ارتداد سے نکاح فسخ ہو جاتا ہے، ساس کو شہوت سے ہاتھ لگانے سے بیوی حرام ہو جاتی ہے، مگر طلاق واقع نہیں ہوتی۔

---

[1] الدر المختار، کتاب الصلاۃ، باب صفة الصلاۃ، فصل فی القراءۃ، ج:۱، ص:۵۳۴، ط: سعید، کراچی

یہ تمام مسائل اس ایک اصل پر مبنی ہیں کہ طلاق کا تعلق قول سے ہے، فعل اور عمل سے نہیں ہے۔

درج ذیل جزئیات کے پسِ پشت بھی یہی اصول کارفرما ہے کہ طلاق کا تعلق زبان کے فعل سے ہے:

"(قوله:ور كنه لفظ مخصوص)...وبه ظهر أن من تشاجر مع زوجته،فأعطاها ثلثة أحجار،ينوى الطلاق،ولم يذكر لفظا،لا صريحًاولا كنايةً،لايقععليه،كماأفتىٰ به"الخير الرملي"وغيره، وكذامايفلعه بعض سكان البوادى من أمرها بحلق شعرها لايقع به طلاق وإن نواه"۔[1]

ترجمہ:''طلاق کا رکن خاص لفظ ہے۔۔۔اس سے معلوم ہوا کہ جس کا اپنی زوجہ سے جھگڑا ہوا اور اس نے اسے طلاق کی نیت سے تین پتھر دے دیے، جب کہ کوئی صریح یا کنائی لفظ زبان سے نہ کہا تو اسے طلاق نہ ہوگی، جیسا کہ علامہ خیر رملی اور دوسروں نے اس کا فتویٰ دیا ہے، اسی طرح جو بعض دیہاتیوں کی عادت ہے کہ بیوی کو اُس کے سر کے بال مونڈھنے کا کہہ دیتے ہیں تو اس سے طلاق نہیں ہوتی، اگرچہ خاوند نے طلاق کی نیت کی ہو''۔

جس طرح ''لفظ'' ان حرفوں کو کہتے ہیں جو انسان کی زبان سے نکلیں، اسی طرح ان حرفوں کو بھی کہتے ہیں جو انسان کے قلم سے نکلیں، اس لیے تحریر سے بھی طلاق واقع ہوجاتی ہے، شرط یہ ہے کہ تحریر واضح ہو اور باضابطہ اور رسمی شکل میں ہو۔ الفاظ اور تحریر کی طرح گونگے بہرے کے جانے پہچانے اشارے سے بھی طلاق واقع ہوجاتی ہے۔ فقہاء

---

[1] ردالمحتار علی الدر المختار، کتاب الطلاق، ۲۳۰/۳ ط:سعید

ان دونوں کو لفظ کے تحت ذکر کرتے ہیں، مگر ہم نے ان کے ذکر سے اجتناب کیا، کیوں کہ ہمارا مقصود صرف حقیقی لفظ ہے، جب کہ کتابت اور اشارے کو حکماً لفظ کہتے ہیں۔

"وأراد(بما)اللفظ أومايقوم مقامه من الكتابة المستبينة أو الإشارةالمفهومة"وفی الرد"وأراداللفظ ولوحكماليدخل الكتابة المستبينة، وإشارة الأخرس،والإشارة إلى العدد بالأصابع"[1]

اس فائدے کا حاصل یہ ہے کہ ''لفظ سے طلاق ہوتی ہے'' اور مقصد یہ ہے کہ نیت، سوچ، فعل اور عمل سے طلاق نہیں ہوتی ہے، بلکہ طلاق کا تلفُّظ ضروری ہے۔

لفظ کا دائرہ چونکہ بہت وسیع ہے اور اس کے عموم میں ہر لفظ داخل ہے، اس لیے اگر لفظ کو اس کے عموم پر باقی رکھا جائے اور اس سے عموم اور اطلاق مراد لیا جائے تو لازم آئے گا کہ ہر لفظ سے طلاق ہو جاتی ہے، حالانکہ یہ تصور خلافِ حقیقت اور مخالفِ شریعت ہے۔ اس خلافِ واقعہ تصور کا ازالہ فائدہ ثانیہ میں کر دیا گیا ہے۔ اگلے فائدے میں قارئین ملاحظہ فرمائیں گے کہ لفظ کے دائرے کو تنگ اور اس کی وسعت کو محدود کر دیا گیا ہے جبکہ آمدہ فوائد میں یہ دائرہ تنگ سے تنگ تر ہوتا چلا جائے گا۔

[1] ردالمحتار على الدر المختار، كتاب الطلاق، باب الصريح، ۳/۲۴۷، ط: سعید

طلاق خاص لفظ سے ہوتی ہے۔

دوسرا فائدہ

طلاق خاص لفظ سے ہوتی ہے

اس دوسرے فائدے میں یہ بیان کرنا مقصود ہے کہ: ''لفظ سے طلاق ہوتی ہے، مگر ہر لفظ سے نہیں، بلکہ ایسے لفظ سے جو طلاق کے معنی پر دلالت کرتا ہو'':

''(وركنه لفظ مخصوص) هو ما جعل دلالةً على معنى الطلاق من صريحٍ أو كنايةٍ''۔ [1]

ترجمہ: ''طلاق کا رکن ایسا مخصوص لفظ ہے جو طلاق کے معنی پر دلالت کرتا ہو، چاہے صریح ہو یا کنایہ ہو''۔

اس لحاظ سے لفظ کی دو قسمیں ہیں:

(۱)......ایک وہ جس میں طلاق کا معنی پایا جاتا ہو۔

(۲)......دوسرا وہ جس میں طلاق کا معنی نہ پایا جاتا ہو۔

جس لفظ سے طلاق کا مطلب نہ نکلتا ہو، اس سے طلاق واقع نہیں ہوتی، اگر چہ

[1] ردالمحتار علی الدر المختار، کتاب الطلاق، ۲۳۰/۳ ط:سعید

شوہر کی نیت اس سے طلاق دینے کی ہو۔وجہ اس کی یہ ہے کہ ہر مطلب اور مفہوم کے لیے کوئی نہ کوئی لفظ مقرر ہوتا ہے اور جب وہ لفظ بولا جاتا ہے تو سامع اگر اہل لسان ہو تو اس سے وہی مطلب سمجھتا ہے۔اب اگر ہر لفظ ہر مطلب اور مفہوم کے لیے استعمال ہونے لگے تو لغت ہی بے فائدہ ہو جائے، زبان سے امان اٹھ جائے، الفاظ کی وضع خاص معانی اور مطالب کے لیے بے کار ہو جائے اور افہام وتفہیم اور تبادلہ خیال جو زبان کا اصل مقصود ہے وہ سخت مشکل بلکہ قریباً ناممکن ہو جائے۔

یہ درست ہے کہ کبھی ایک لفظ بول کر اصل معنی کے علاوہ دوسرا معنی مراد لیتے ہیں، جیسا کہ مجاز میں ہوتا ہے، لیکن وہاں بھی حقیقی اور مجازی معنی میں کوئی ربط اور جوڑ ہوتا ہے، جسے ''علاقہ'' سے تعبیر کرتے ہیں اور اس علاقے کے لیے بھی شرط ہے کہ ''خاص اور مشہور'' معنی میں ہو، ورنہ جہاں لفظ کا مطلب سے کوئی جوڑ نہ ہو، وہاں ایسا بے ربط اور بے جوڑ استعمال درست نہیں۔ بہادر انسان کو شیر کہا جاسکتا ہے، لیکن آسمان بول کر زمین مراد نہیں لی جاسکتی ہے، کیونکہ دونوں میں کوئی جوڑ ہی نہیں ہے۔

فقہاء بھی ہر باب کے تحت خاص الفاظ اور مخصوص کلمات ذکر کرتے ہیں، چنانچہ کتاب النکاح کے شروع میں نکاح پر دلالت کرنے والے اور بیع کے آغاز میں بیع پر دلالت کرنے والے الفاظ ذکر کیے جاتے ہیں۔مقصد یہی ہوتا ہے کہ مطلوبہ مقصد کے لیے اس پر دلالت کرنے والے مخصوص کلمات اور خاص تعبیرات کا استعمال ہی ضروری ہے۔جو شخص بیوی کو ''باپ'' کہتا ہے یا اسے ''یار'' کہہ کر پکارتا ہے یا کہتا ہے کہ ''میں نے تجھ سے شادی ہی نہیں کی'' تو وہ ایسا جملہ استعمال کرتا ہے جس سے طلاق کا مطلب ہی نہیں نکلتا، اس لیے طلاق بھی واقع نہیں ہوتی ہے۔ایسے موقع پر یہ دلیل بے وزن ہے

کہ شوہر نے طلاق کی نیت سے ایسا جملہ استعمال کیا ہے، کیوں کہ جب لفظ میں طلاق کے معنی کی گنجائش نہیں تو نیت سے اس میں طلاق کا مطلب پیدا نہیں کیا جا سکتا۔

ملک العلماء علامہ ابوبکر بن مسعود احمد الکاسانیؒ (المتوفی ۵۸۷ھ) ایک عمومی قاعدے، مسلمہ ضابطے اور فقہی اصول کے انداز میں فرماتے ہیں:

"کل لفظ لایحتمل الطلاق لایقع به الطلاق وإن نوى، مثل قوله: بارک الله علیک، أو أطعمینی، أو اسقینی"۔[۱]

ترجمہ: "ہر وہ لفظ جس میں طلاق کا احتمال نہ ہو، اس سے طلاق بھی نہیں ہوتی، اگرچہ شوہر نے طلاق کی نیت کی ہو، جیسے: "اللہ تمہیں برکت دے"، "مجھے کھلاؤ"، "مجھے پلاؤ"۔

درج ذیل الفاظ اسی قاعدے پر تفریع ہیں:

"اسقینی ونوى الطلاق به، ولو قال: لم أتزوجک ونوى الطلاق لایقع الطلاق بالإجماع۔۔۔ والله ماأنت لی امرأة لایقع الطلاق وإن نوى بالاتفاق"۔[۲]

ترجمہ: "مجھے پانی پلا" اور اس کہنے سے طلاق کی نیت کی، یا اگر طلاق کی نیت سے کہا کہ میں نے تم سے نکاح نہیں کیا تو بالاتفاق طلاق واقع نہ ہوگی......شوہر نے کہا: "خدا کی قسم تو میری بیوی نہیں ہے" طلاق نہ ہو گی، اگرچہ طلاق کی نیت سے کہا، اس پر سب کا اتفاق ہے۔"

"ولو قال: لم أتزوجک ونوىٰ الطلاق لایقع الطلاق بالإجماع وکذا إذا قال: ماأنتِ لی بامرأة، أو قال: علی حجة ماأنت لی بامرأة

---

[۱] بدائع الصنائع، فصل في طلاق الکتابة، ۱۷۲/۳، ط: دار إحیاء التراث العربي

[۲] بدائع الصنائع، کتاب الطلاق، فصل في طلاق الکتابة، ۱۷۱/۳، ط: دار احیاء التراث العربي

أنه لايقع الطلاق وإن نوى بالاتفاق"۔[1]

''بدائع الصنائع'' کی چند اور قاعدہ نما عبارتیں اور فقاہت بھرے جملے ملاحظہ کیجیے:

"... ويستحيل أن يثبت باللفظ مايمنع ثبوته"۔[2]

ترجمہ: ''یہ ناممکن ہے کہ لفظ سے ایسا معنی ثابت کیا جائے جس کا لفظ میں امکان ہی نہ ہو۔''

"نوىٰ مالايحتمله لفظه فتبطل نيته"۔[3]

ترجمہ: ''لفظ سے کسی ایسے معنی کا ارادہ کیا جس کی لفظ میں گنجائش ہی نہیں ہے تو اس کی نیت کا اعتبار ہی نہیں ہے۔''

اصولِ فقہ کے مشہور متن ''المنار'' کے شارح ''عزالدین عبداللطیف بن عبد العزیز بن ملک'' نے دوسطروں میں پوری بحث کی روح اور اس کا عطر کشید کردیا ہے، اُن کی عبارت کے بعد پھر مزید کسی تفصیل کی ضرورت باقی نہیں رہتی، وہ لکھتے ہیں:

"والأصل أن موجب اللفظ يثبت باللفظ ولايفتقر إلى النية، ومحتمل اللفظ لايثبت إلا إذانوى، ومالايحتمله اللفظ لايثبت وإن نوىٰ"۔[4]

ترجمہ: ''اصل یہ ہے کہ لفظ کا موجب لفظ سے ہی ثابت ہوجاتا ہے اور نیت کا محتاج نہیں ہوتا ہے اور جس معنی کا لفظ میں احتمال ہو وہ متکلم کی نیت سے ثابت ہوتا ہے اور جس معنی کا لفظ میں احتمال ہی نہ ہو وہ نیت سے بھی ثابت نہیں ہوتا ہے۔''

کتب فقہ وفتاوی میں بہت سارے الفاظ کے متعلق قارئین یہ جملہ ملاحظہ فرمائیں گے ''لا يقع وإن نوىٰ'' یعنی نیت کے باوجود اس لفظ سے طلاق واقع نہیں ہوگی، اس کی وجہ یہی ہوگی کہ لفظ سے طلاق کا مفہوم نکلتا ہی نہ ہوگا۔

---

[1] بدائع الصنائع، كتاب الطلاق، فصل، وأما الكناية فنوعان، ۳/۱۰۸، ط: سعيد

[2] بدائع الصنائع، كتاب الطلاق، فصل، وأما الكناية فنوعان، ۳/۱۰۸، ط: سعيد.

[3] بدائع الصنائع، كتاب الطلاق، فصل في بيان ألفاظ الطلاق، ۳/۱۴۵، ط: دار إحياء التراث العربي.

[4] شرح منار الأنوار في أصول الفقه للمولى عبداللطيف الشهير بابن الملک، تحت: الأمر لايقتضي التكرار ولا يحتمله، ص: ۳۱، ط: دار الكتب العلمية.

طلاق صریح یا کنایہ سے ہوتی ہے۔

تیسرا فائدہ

طلاق صریح یا کنایہ سے ہوتی ہے۔

اب تک جو کچھ بیان ہوا، اس کا حاصل یہ ہے کہ طلاق ایسے لفظ سے ہوتی ہے جو طلاق کا مطلب ومفہوم رکھتا ہو۔ جو لفظ اس خصوصیت کا حامل اور اس معیار پر پورا اترتا ہو، اس کی پھر دو قسمیں ہیں:

۱:......صریح

۲:......کنایہ [۱]

''صریح'' کا غالب استعمال طلاق کے معنی میں ہوتا ہے، جب کہ کنایہ میں طلاق کے علاوہ دوسرے معنی کی بھی گنجائش ہوتی ہے۔ یہ فائدہ ان دونوں کے بیان میں ہے۔ اگر ہم اس فائدے کو پچھلے دو فوائد کے ساتھ ملا کر بیان کریں تو تعبیر یوں ہوگی کہ

---

[۱] فالألفاظ التی یقع بھا الطلاق في الشرع نوعان: صریح و کنایة۔۔۔(بدائع الصنائع، کتاب الطلاق، فصل في النیة في طلاق الکنایة، ۳/۱۶۱، ط: دار احیاء التراث العربي، و کذا في رد المحتار، کتاب الطلاق، باب الصریح، ۳/۲۴۷، ط: سعید)

''طلاق صرف صریح یا کنایہ لفظ سے ہوتی ہے۔''

صریح اور کنایہ کی بحث انتہائی اہمیت کی لائق بحث ہے، اس لیے پہلے ان پر کچھ عمومی نوعیت اور تعارفی قسم کی گفتگو مفید معلوم ہوتی ہے، یہ گفتگو ان دونوں کے تصور، مفہوم اور احکام کو سمجھنے میں ممد و معاون ہوگی۔

صریح کی تعبیر وتفسیر:

انسان نے جس دن سے لکھنا سیکھا ہے، اسی دن سے اس کی خواہش رہی ہے کہ جو کچھ وہ تحریر کرے وہی پڑھا جائے اور جو پڑھا جائے وہی سمجھا جائے۔ اسی طرح جب سے انسان نے بولنا سیکھا ہے، اس کی کوشش ہوتی ہے کہ جو کچھ وہ کہے وہی سنا جائے اور جو سنا جائے وہی سمجھا جائے، اس کے الفاظ سے باہر اس کی نیت تلاش نہ کی جائے اور اس کی طرف کوئی ایسا مقصد منسوب نہ کیا جائے جو اس کے الفاظ سے ظاہر نہ ہوتا ہو۔ یہ ایک عمدہ اور سنہرا اصول ہے اور الفاظِ طلاق کی تعبیر وتشریح کرتے وقت بہت مفید اور معاون ثابت ہوتا ہے۔

اس اصول کی رو سے جب شوہر اپنی زوجہ کے متعلق طلاق کا کوئی صاف، سادہ اور واضح لفظ استعمال کر لیتا ہے، جس میں کوئی ابہام اور پیچیدگی نہیں ہے تو اس کا مقصد وہی ہے جو لفظوں میں اس نے بیان کر دیا ہے۔ اب اس کی نیت ٹٹولنے کی ضرورت اور اس کا منشا سمجھنے کی جستجو درست نہیں ہے، جو کچھ کہنا تھا اس نے صاف اور سیدھے لفظوں اور کھلے اور واضح جملے میں کہہ دیا ہے۔ اپنے منشا کے بیان اور مقصد کے اظہار کے لیے جو الفاظ اس نے چنے ہیں، وہ اس کی نیت کے مظہر ہیں اور اسی سے اس کا عندیہ معلوم ہو گیا ہے۔ ایسی صورت حال میں جب کہ اس کے الفاظ غیر مجمل اور غیر مبہم ہیں اور ان

میں کوئی اغلاق اور پیچیدگی نہیں ہے، اس کی نیت تلاش کرنے اور اس کے الفاظ میں کوئی اور معنی ڈھونڈنے کی ضرورت نہیں، اس موقع پر مفتی کو تفسیر وتشریح سے ہاتھ کھینچ لینا چاہیے اور لفظ کو اس کا فطری معنی اور مستعمل مفہوم پہنا کر اس کا حکم بتا دینا چاہیے۔ وجہ وہی ہے کہ شوہر نے اپنی نیت خود ہی اپنے الفاظ میں بیان کر دی ہے۔ یہ جاننا مفتی کا فریضہ نہیں ہے کہ شوہر کی نیت کیا تھی؟ بلکہ اُسے یہ دیکھنا چاہیے کہ شوہر نے کہا کیا ہے؟ کیونکہ جو کچھ اس نے کہا ہے، وہی اس کی نیت ہے۔

اس لمبی چوڑی اور طول طویل تمہید کو فقہاء ایک مختصر اور بلیغ جملے میں سمیٹ کر اس طرح بیان کرتے ہیں کہ: ''صریح نیت کا محتاج نہیں ہوتا ہے۔''

جب اس جملے کی فقہی نقطۂ نظر سے تشریح کی جاتی ہے تو تین صورتیں سامنے آتی ہیں:

۱:......شوہر کی نیت صریح سے طلاق دینے کی ہو۔

۲:......شوہر کی کوئی نیت نہ ہو۔

۳:......شوہر طلاق کے برعکس کوئی اور نیت رکھتا ہو۔

پہلی دو صورتوں کا حکم واضح اور غیر اختلافی ہے۔ شوہر کی نیت طلاق کی ہو یا کچھ نیت نہ ہو، صریح کے استعمال سے طلاق واقع ہو جائے گی، لیکن اگر وہ طلاق کے علاوہ کوئی اور نیت رکھتا ہو تو اس کا اعتبار ہوگا یا نہیں؟ قضا اور دیانت کی بحث میں اس پر گفتگو ہوگی۔

کنایہ کی توضیح وتشریح:

الفاظ انسان کے مافی الضمیر کے پوری طرح آئینہ دار ہوتے ہیں، مگر سامع اس وقت یقینی طور پر متکلم کا مقصد پا لیتا ہے، جب لفظ ایک ہی مفہوم کا حامل ہو اور اپنے مفہوم

میں واضح بھی ہو۔ اس صورت میں نہ تعبیر وتشریح کی ضرورت پڑتی ہے اور نہ نیت جانچنے کی حاجت ہوتی ہے، بلکہ لفظ اپنے مروج معنی میں مستعمل اور عام فہم معنی میں متعین سمجھا جاتا ہے، لیکن جب لفظ ایک سے زائد معنی ومفہوم رکھتا ہو تو پھر صرف لفظ پر کامل اعتماد اور کلی انحصار نہیں کیا جاسکتا اور یقینی طور پر یہ نہیں کہا جاسکتا کہ متکلم کی نیت اس کے کلام سے واضح ہے۔ زیادہ سے زیادہ کسی ایک معنی کے متعلق قیاس کیا جاسکتا ہے، مگر ہوسکتا ہے کہ شوہر سامع کے قیاس کے برعکس کوئی اور نیت رکھتا ہو۔ کنایہ کے استعمال کی صورت میں کچھ ایسی ہی صورت ہوتی ہے، کیوں کہ اس میں طلاق کے علاوہ دوسرے معنی کا بھی احتمال ہوتا ہے، اس وجہ سے اس کی ممکنہ تعبیریں بھی ایک سے زیادہ ہوتی ہیں اور جب لفظ متعدد تعبیرات کا حامل اور ایک سے زیادہ تشریحات کا احتمال رکھتا ہو تو پھر کسی ممکنہ تعبیر اور محتمل تشریح کو حتمی طور پر شوہر کی جانب منسوب نہیں کیا جاسکتا، جب تک ایسا کرنے کے لیے کوئی معقول دلیل نہ ہو۔

معقول دلیل یا تو شوہر کی نیت ہے کہ وہ خود بیان کردے کہ کنایہ کے استعمال سے اس کی مراد کیا تھی یا پھر قرینہ ہے جس سے شوہر کی نیت سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ ان دونوں کے ذریعے یا دونوں میں کسی ایک کے ذریعے ایک ممکنہ معنی کی نفی اور دوسری کا اثبات یہی کنایہ کی تعبیر وتشریح ہے اور مفتی پر تعبیر وتشریح کی یہ نازک اور حساس ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ صریح میں تو وہ تشریح سے ہاتھ کھینچ لیتا ہے، مگر کنایہ میں اس کی حیثیت معبر اور مفسر کی ہوتی ہے اور اس کے سامنے ایک بنیادی نوعیت کا سوال اُٹھ کھڑا ہوتا ہے کہ کنایہ کے استعمال سے شوہر کا منشا کیا تھا؟ اس نے کس غرض اور مقصد سے کنایہ کا استعمال کیا ہے؟

شوہر سے دریافت کرنے پر اگر وہ خود اظہار کرلیتا ہے کہ اس کا ارادہ طلاق دینے کا تھا تو مزید کھوج کرید کی ضرورت نہیں، کیونکہ متکلم سے بڑھ کر کوئی اس کے قول کا شارح اور نیت کا ترجمان نہیں ہوسکتا، شوہر اس وجہ سے بھی سچا سمجھا جائے گا کہ وہ لفظ سے خلافِ ظاہر معنی مراد نہیں لے رہا، کیونکہ لفظ اس کی نیت کا ساتھ دیتا ہے اور اس تہمت کی بھی نفی ہوجاتی ہے کہ اس نے تخفیف کی غرض سے اپنی نیت طلاق کی بیان کی ہے۔ بہرحال اس کی نیت معتبر، اس کا بیان قابل قبول اور اس کی بیوی پر طلاق واقع سمجھی جائے گی۔

اگر شوہر طلاق کی نیت کا انکار کرتا ہے تو چونکہ نیت ایک قلبی فعل، داخلی جذبہ، نگاہ سے اوجھل اور حواس سے مستور فعل ہے، اس لیے دیکھا جائے گا کہ ظاہری احوال بھی اس کی نیت کی تصدیق کرتے ہیں یا نہیں؟ اگر قرائن اور علامات جسے فقہاء ''دلالت حال'' سے تعبیر کرتے ہیں، نیت پر دلالت کرتے ہوں تو اسی سے شوہر کی نیت اخذ کی جائے گی اور یہ باور کیا جائے گا کہ شوہر کی نیت اپنی زوجہ کو طلاق دینے کی تھی۔

اگر اس کی نیت بھی طلاق کی نہ ہو اور کوئی قرینہ بھی اس کی نیت پر دلالت نہ کرتا ہو تو طلاق کے عدمِ وقوع کا فیصلہ کیا جائے گا۔ ہم اختصار کے ساتھ یوں کہہ سکتے ہیں کہ کنایہ سے طلاق اس وقت واقع ہوتی ہے جب شوہر کی نیت طلاق کی ہو یا قرائن سے اس کی نیت طلاق دینے کی معلوم ہوتی ہو۔

صریح کی طرح کنایہ کے متعلق بھی یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر شوہر طلاق کی نیت کا انکار کرتا ہے تو عنداللہ اس کی نیت قابل قبول ہوگی یا نہیں؟ یہ بات اتفاقی ہے کہ عنداللہ اس وقت طلاق ہوگی جب اس کی نیت طلاق کی ہو، یہ بات بھی بے غبار اور غیر

اختلافی ہے کہ قاضی اس نیت کے مطابق نہیں بلکہ قرائن کو مدنظر رکھ کر فیصلہ صادر کرے گا، مگر کیا مفتی بھی اس کی نیت کے مطابق اُسے فتویٰ دینے کا پابند ہے؟ اس پر ایک مستقل عنوان (قضا و دیانت) کے تحت گفتگو ہوگی۔ صریح اور کنایہ کے عمومی تصور اور اجمالی خاکے کے بعد اب ان پر اصولی اور فقہی اعتبار سے گفتگو کی جاتی ہے۔

صریح

اصول فقہ کے علماء ''صریح'' اُسے کہتے ہیں جس کا معنی صاف اور واضح ہو، فقہاء طلاق کے مسائل میں صریح اُسے کہتے ہیں'' جس کا استعمال صرف طلاق کے لیے ہوتا ہو۔[1] اس کثرتِ استعمال سے اس کا معنی اتنا معروف، مطلب اتنا صاف اور مفہوم ایسا واضح ہوتا ہے کہ بولتے ہی اس کا مقصد سمجھ میں آجاتا ہے اور ذہن اصل مطلب اور مقصودی معنی کے علاوہ کسی اور طرف نہیں جاتا۔ دونوں تعریفات کے فرق سے دونوں علوم کا مزاج صاف ظاہر ہے، اُصولی کی نظر لفظ کے فی نفسہ معنی پر ہے کہ وہ روشن ہے کہ نہیں، اُسے اس سے غرض نہیں کہ صریح اس معنی میں استعمال بھی ہوتا ہے یا نہیں، جب کہ فقیہ کی نگاہ لفظ کے استعمال پر ہے۔ فقہ ایک عملی اور تطبیقی علم ہے، اس لیے فقہاء کی نظر عملی پہلو پر رہتی ہے، جب کہ اصول فقہ ایک عقلی اور نظری علم ہے، اس لیے اصطلاح میں بھی عملیت کی بجائے نظریت صاف جھلک رہی ہے۔

عام کتابوں میں درج ہے کہ صریح کا استعمال صرف طلاق کے لیے ہوتا ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ صریح کا سو فیصد اور کلی استعمال صرف طلاق کے لیے نہیں ہوتا ہے، بلکہ قلیل ہی سہی، اس میں غیر طلاق کی بھی گنجائش ہوتی ہے، اس لیے مبنی بر حقیقت تعریف یہ

---

[1] (صريحه مالم يستعمل إلا فيه) ولو بالفارسية، (الدر المختار) (قوله مالم يستعمل إلا فيه) أي غالبا كما يفيده كلام البحر "۔ (ردالمحتار، كتاب الطلاق، باب الصريح، ۲۴۷/۳، ط: سعيد)

معلوم ہوتی ہے کہ صریح کا اکثر وبیشتر یعنی غالب اور عمومی استعمال طلاق کے لیے ہوتا ہے۔ یہی تعریف فتاویٰ شامی میں بحر کے حوالے سے منقول ہے۔ [۱]

صریح کا حکم یہ ہے کہ اس کا تکلم گویا اس کے معنی کا تکلم ہوتا ہے۔ لفظ ہی سے متکلم کی نیت ظاہر ہو جاتی ہے، اس لیے اس کا منشا دریافت کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی ہے۔ طلاق کا لفظ اور اس سے مشتق مختلف صیغے اس بارے میں صریح تصور ہوتے ہیں جیسے: ''تجھے طلاق ہے، ''طلاق دی''، ''تجھے طلاق دیتا ہوں'' وغیرہ۔

یہ سوال کہ کون سا لفظ صریح ہے؟ اس کا مدار عرف پر ہے۔ عرف سے کوئی لفظ صریح بنتا ہے اور عرف ہی صریح کو کنایہ اور کنایہ کو صریح بنا دیتا ہے۔ کسی لفظ کا معنی فی نفسہ بہت ہی واضح اور روشن ہو اور اس میں کوئی ابہام اور پوشیدگی نہ ہو، مگر اس کا عام استعمال طلاق کے لیے نہ ہوتا ہو تو فقہاء کے نزدیک وہ صریح نہیں، اس کے برعکس ایک ایسا لفظ جس کا مطلب فی نفسہ مبہم اور پوشیدہ ہے، مگر اس کا اکثر وبیشتر استعمال طلاق کے لیے ہوتا ہے تو وہ صریح ہے۔ [۲]

---

[۱] أما الصريح فهو الذی لا يستعمل إلا في حل قيد النكاح وهو لفظ الطلاق أو التطليق۔۔۔۔ سمی هذا النوع صريح ا لأن الصريح فی اللغة اسم لما ظاهر المراد مكشوف المعنى عند السامع من قولهم "صرح فلان بالأمر أی كشفه وأوضحه۔۔۔۔ وهذه الألفاظ ظاهرة المراد، لأنها لا تستعمل إلا في الطلاق عن قيد النكاح فلا يحتاج فيها إلى النية لوقوع الطلاق، إذ النية عملها فی تعيين المبهم ولا إبهام فيها"۔ (بدائع الصنائع، كتاب الطلاق، فصل في النية في طلاق الكناية، ۳/ ۱۶۱، ط: دار إحياء التراث العربي وكذا في رد المحتار، كتاب الطلاق، باب الصريح، ۳/ ۲۴۷، ط: سعيد)

[۲] والأصل الذی عليه فتویٰ فی زماننا هذا فی الطلاق بالفارسية أنه إن كان فيها لفظ لا يستعمل إلا فی الطلاق فذلک اللفظ صريح يقع به الطلاق من غير نية إذا أضيف إلى المرأة مثل أن يقول فی عرف فی ديارنا "رها كنم" أو فی عرف خراسان والعراق بهشتم لأن الصريح لا يختلف باختلاف اللغات وماكان فی الفارسية من الألفاظ مايستعمل فی الطلاق وفی غيره فهو من كنايات الفارسية فيكون حكمه حكم كنايات العربية فی جميع الاحكام۔" (بدائع الصنائع، كتاب الطلاق، فصل الطلاق بالألفاظ الفارسية، ۳/ ۱۶۴، ط: دار إحياء التراث العربي)

صریح پر بہ قدرِ ضرورت گفتگو کے بعد اب کنایہ کا بیان شروع ہوتا ہے، جس کا بیان طویل، مسائل غامض اور فہم ذرا مشکل ہے۔ کنایات سے فقہاء کے دقتِ فہم، قوتِ نظر، عمیق مشاہدے، حقیقت بیں نگاہ اور عرف سے بھرپور واقفیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

کنایہ علماء اصول کے نزدیک جس لفظ کی مراد پوشیدہ ہو، وہ کنایہ ہے۔ یہی مطلب فقہاء کے نزدیک بھی ہے، مگر طلاق کے مسائل میں جو لفظ اصلاً طلاق کے لیے نہ ہو، مگر طلاق اور غیر طلاق کا احتمال رکھتا ہو، وہ کنایہ ہے۔[1]

کنایہ کا لغوی معنی صاف اور واضح ہوتا ہے، مگر مقصودی معنی میں ابہام اور پوشیدگی ہوتی ہے، جسے دور کرنے کے لیے اور متکلم کا اصل مقصد سمجھنے کے لیے دلیل کی ضرورت ہوتی ہے، جب کہ صریح کی صورت میں یہ ضرورت نہیں ہوتی، وہاں متکلم کے الفاظ سے ہی اس کی نیت کا اندازہ ہوجاتا ہے، اس کے برعکس کنایہ کے استعمال کی صورت میں صورت حال مختلف ہوتی ہے، شوہر گول مول الفاظ استعمال کرتا ہے اور اپنے مقصد کو کھول کر اور وضاحت کے ساتھ بیان نہیں کرتا ہے، اس لیے اس سے پوچھنے اور گردوپیش کے حالات پر غور کرنے کی ضرورت پڑتی ہے۔

طلاق اور غیر طلاق کا مطلب

یہ نکتہ نہایت اہمیت کے لائق ہے، اس لیے اسے جلی عنوان کے ساتھ ذکر کرنے

---

[1] (كنايته)عندالفقهاء(مالم يوضع له)أى الطلاق(واحتمله)وغيره(فالكنايات لاتطلق بهاقضاء إلا بنية أو دلالة الحال)وهى حالة مذاكرة الطلاق أوالغضب،(قوله كنايته عند الفقهاء)أى كناية الطلاق المرادة فى هذاالمحل وإلا فمعناها عندهم مطلقا كالأصوليين:ما استترالمراد منه فى نفسه۔(الدر المختارمع رد المحتار،كتاب الطلاق،باب الكنايات ، ۲۹۶/۳،ط:سعيد)

کی ضرورت پیش آرہی ہے۔ کنایہ کی تعریف میں کہا گیا کہ وہ طلاق اور غیر طلاق کا احتمال رکھتا ہے۔ اس ''طلاق اور غیر طلاق'' کی وضاحت ضروری ہے۔ مختصراً یہ کہ کنایہ کے بیان میں طلاق سے مراد ''جواب'' کا معنی ہے اور جواب کا مطلب یہ ہے کہ شوہر نے طلاق کے مطالبے کو منظور کرتے ہوئے طلاق دے دی ہے۔ ''غیر طلاق'' سے مراد ''سب وشتم'' یا ''رد'' کا معنی ہے۔ آگے آئے گا کہ کنایہ الفاظ کی تین قسمیں ہیں اور حاصل اس کا یہ ہے کہ کچھ کنایات صرف ''جواب'' کا اور کچھ جواب کے ساتھ ''رد'' کا اور کچھ جواب کے ساتھ ''سب وشتم'' کا احتمال رکھتے ہیں۔ فقہاء جب کہتے ہیں کہ کنایہ طلاق کا احتمال رکھتا ہے تو اس احتمال سے جواب کا معنی مراد ہوتا ہے، یہ معنی تمام کنایات میں پایا جاتا ہے اور اُسے سب کی مشترکہ خصوصیت کہہ سکتے ہیں۔

''غیر طلاق'' کے احتمال سے مراد ''سب وشتم'' یا ''رد'' کا معنی ہے۔ جب کنایہ کو اس معنی پر حمل کرتے ہیں تو اس سے طلاق نہیں ہوتی، کیونکہ رد کا مطلب ہے کہ شوہر نے طلاق کو مسترد کر دیا ہے اور سب وشتم کا مطلب ہے کہ شوہر طلاق نہیں دے رہا، بلکہ گالی گلوچ پر اتر آیا ہے اور بیوی کی توہین اور تذلیل کر رہا ہے، البتہ جب کنایہ سے جواب کا معنی مراد لیتے ہیں تو طلاق واقع سمجھی جاتی ہے اور جواب کا معنی شوہر کی نیت سے ثابت ہوتا ہے یا پھر حالات اس پر دلالت کرتے ہیں۔

اس تفصیل سے ظاہر ہے کنایہ کی تعریف میں ''غیر طلاق'' سے مراد ہر اس مطلب کی نفی نہیں جو طلاق کے علاوہ ہو، بلکہ اس سے خاص ''گالی گلوچ'' یا ''رد'' کا مطلب مراد ہے۔ اب جو لفظ صرف طلاق کے لیے یا عموماً طلاق کے لیے استعمال ہوتا ہے وہ تو صریح ہے اور جو صرف جواب کا یا اس کے ساتھ رد یا سب کا بھی احتمال رکھتا ہے

وہ کنایہ ہے اور جو نہ صریح ہے اور نہ ان تینوں معانی میں سے کسی ایک کا احتمال رکھتا ہے تو وہ طلاق کا لفظ ہی نہیں ہے اور اس سے طلاق واقع ہو ہی نہیں سکتی، اگرچہ شوہر اُسے طلاق کی نیت سے استعمال کرے۔ اسی وجہ سے اس تیسرے فائدے کے آغاز میں کہا گیا تھا کہ طلاق صرف صریح یا کنایہ الفاظ سے پڑتی ہے۔

بہر حال طلاق اور طلاق کے علاوہ کا احتمال رکھنے کی وجہ سے لفظ میں تردد پیدا ہو جاتا ہے، اس تردد کو دور کرنے، ایک احتمال کو دوسرے احتمال پر فوقیت دینے اور دونوں معانی میں سے کسی ایک معنی کی تعیین کے لیے دلیل کی ضرورت پڑتی ہے، دلیل یا تو شوہر کا بیان ہے کہ وہ اپنی منشا کا اظہار کردے یا قرائن وشواہد ہیں، جن سے شوہر کی نیت سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ فقہاء اول الذکر کو نیت اور مؤخر الذکر کو دلالت حال سے تعبیر کرتے ہیں، اسی وجہ سے کہا جاتا ہے کہ کنایات سے طلاق اس وقت واقع ہوتی ہے کہ جب یا تو شوہر طلاق کی نیت کا اظہار کردے یا موقع وحال سے معلوم ہو کہ شوہر نے طلاق کی نیت سے کنایہ کا استعمال کیا ہے۔

نیت اور دلالت کا فرق:

۱:......نیت کا تعلق صرف شوہر کی ذات سے ہے، جب کہ دلالت حال شوہر کے ساتھ خاص نہیں ہے، مثلاً: دلالت کی ایک قسم مذاکرۂ طلاق کی ہے اور مذاکرۂ طلاق جس طرح شوہر کے طلاق دینے سے ثابت ہوتا ہے، اسی طرح بیوی کی طرف سے طلاق کے مطالبے اور اجنبی کی جانب سے طلاق کے تقاضے سے بھی ثابت ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اگر ماحول پر سکون اور معتدل ہے تو وہ حالت رضا ہے، ظاہر ہے کہ میاں بیوی مل کر ایسے ماحول کی تشکیل کرتے ہیں، معلوم ہوا دلالت کا تعلق نیت کی طرح صرف شوہر کے ساتھ

نہیں، بلکہ مجموعی ماحول سے ہے۔

۲:...... نیت شوہر کا داخلی جذبہ ہے، اس لیے اس کا ثبوت شوہر کے اظہار پر موقوف ہے اور اس کے ہونے یا نہ ہونے میں اس کا قول حجت ہے، جبکہ دلالت حال مشاہدے میں آتی ہے اور حواس سے اُسے محسوس کیا جاسکتا ہے، گویا ایک باطنی اور معنوی ہے اور دوسرا حسی اور مشاہداتی ہے۔ حسی ہونے کی بناء دلالتِ حال زیادہ قوی ہے اور اُسے شہادت سے ثابت کیا جاسکتا ہے، مگر نیت کو شہادت سے ثابت نہیں کیا جاسکتا۔

۳:...... اگر دونوں میں تزاحم وتصادم ہو تو مفتی کا فتویٰ نیت پر اور قاضی کا فیصلہ دلالت حال پر ہوگا۔ مطلب یہ ہے کہ شوہر کنایہ سے کوئی ایسی نیت بیان کرتا ہے جس کو دلالتِ حال جھٹلاتا ہے تو قاضی شوہر کی نیت کا اعتبار نہیں کرے گا۔

۴:...... نیت ہو تو کنایہ کی تینوں قسموں میں سے ہر ایک سے طلاق واقع ہوسکتی ہے، دلالت حال کی ضرورت نہیں، جبکہ دلالت حال کی وجہ سے بعض کنایات سے بلانیت طلاق واقع ہوجاتی ہے، جبکہ بعض میں نیت کی موجودگی لازم ہوتی ہے۔ گویا دلالت کے ساتھ نیت کی بھی ضرورت واقع ہوجاتی ہے، مگر نیت تنہا بھی کافی ہوجاتی ہے۔

ان وجوہات کی بنا پر دونوں میں فرق ہے، مگر اس فرق کے باوجود دونوں قضاءً طلاق کی شرطیں ہیں، عنداللہ صرف اس وقت طلاق واقع ہوگی جب شوہر کی نیت طلاق کی ہوگی:

”فالکنایات لاتطلق بها قضاءً إلا بنيةٍ او دلالةِ الحال۔ در علی التنویر۔(قوله قضاء) قيد به لانهٔ لا يقع ديانةً بدون النية، ولو

وجدت دلالة الحال، فوقوعه بواحد من النية أو دلالةٍ إنما هو فی القضاء فقط کما هو صریح البحر وغیره"۔(۲۹۷/۳، ط:سعید)

دلالتِ حال کی تقسیم:

نیت کا مطلب تو واضح ہے، دلالتِ حال سے مراد وہ سچویشن ہے جس میں شوہر نے کنایہ کا استعمال کیا ہے، فقہاء حصر کے ساتھ اُسے تین حالتوں میں بیان کرتے ہیں:

۱:......رضامندی کی حالت

۲:......غضب کی حالت

۳:......مذاکرۂ طلاق کی حالت

مذاکرۂ طلاق کا مطلب یہ ہے کہ بیوی کی طرف سے طلاق کا مطالبہ ہو یا کسی تیسرے فرد کی جانب سے طلاق کا اصرار اور تقاضا ہو، ان دونوں صورتوں کو مطالبۂ طلاق سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ اگر شوہر کنایہ کے استعمال سے پہلے طلاق دے چکا ہے تو اس سے بھی مذاکرۂ طلاق ثابت ہوجاتا ہے، اس تیسری صورت کو "تقدیم الإیقاع" کہتے ہیں۔[1] حالت غضب یہ ہے کہ شوہر غصے میں ہو، عموماً یہ کیفیت اس وقت ہوتی ہے کہ

---

[1] قال فی البحر: وبه علم أن الحوال ثلثة: حالة مطلقة عن قیدی الغضب والمذاکرة وحالة المذاکرة وحالة الغضب۔(أیضا)(قوله أو دلالة الحال) المراد بها الحالة الظاهرة المفیدة لمقصوده، ومنها تقدم ذکر الطلاق۔۔۔قوله وهی حالة مذاکرة الطلاق) أشار به إلی ما فی النهر من أن دلالة الحال تعم دلالة المقال، قال: وعلی هذا فتفسر المذاکرة بسؤال الطلاق، أو تقدیم الإیقاع کما اعتدی ثلاثًا وقال قبله، المذاکرة ان تسأله هی أو الأجنبی الطلاق- (رد المحتار، کتاب الطلاق، باب الکنایات، ج ۲۹۷/۳ ط:سعید)

مذاکرۂ طلاق کی تفسیر میں یہی صورتیں بیان ہوئی ہیں، اگر ان میں حصر مراد ہو تو یہ نتیجہ نکالنا درست ہوگا کہ مذاکرہ سے مراد محض طلاق کا تذکرہ نہیں ہے، مثلاً شوہر کہے کہ: "ہندہ کو اس کے شوہر نے طلاق دے دی اور وہ میکے چلی گئی، تم بھی والدین کے ہاں چلی جاؤ" اس کہنے سے مذاکرہ ثابت نہیں ہوگا، لیکن اگر بیوی کہے کہ: "صاف لفظوں میں کہہ دو کہ میں نے طلاق دی تو میں چلی جاتی ہوں" اور شوہر جواب دے کہ: جہنم میں جاؤ" تو مذاکرہ ثابت ہوجائے گا۔

جب زوجین میں جھگڑا چل رہا ہو اور جب نہ مذاکرہ ہو اور نہ غیظ وغضب ہو تو وہ رضا مندی کی حالت ہے۔

کنایات کی تقسیم:

ان تینوں حالتوں میں جو لفظ استعمال ہوگا، وہ بھی درج ذیل تین قسموں میں سے کوئی ایک ضرور ہوگا:

۱:...... جو جواب اور رد دونوں کا احتمال رکھتا ہو۔

۲:...... جو جواب اور سب وشتم کا احتمال رکھتا ہو۔

۳:...... جو صرف جواب بننے کی صلاحیت رکھتا ہو۔

اس تفصیل سے ظاہر ہے کہ کنایات سب کے سب جواب بننے کی صلاحیت رکھتے ہیں، گویا جواب کی صلاحیت رکھنا سب کنایات میں قدر مشترک ہے، یہی وجہ ہے کہ نیت ہو تو کنایات میں سے ہر ایک سے طلاق واقع ہوجاتی ہے، پھر جواب کی صلاحیت ہونے کے ساتھ ان کنایات میں سے بعض میں یہ اضافی صفت بھی ہے کہ وہ ''رد'' کا بھی احتمال رکھتے ہیں اور بعض دیگر میں رد کا احتمال تو نہیں، مگر ان میں سب وشتم کی زائد خصوصیت پائی جاتی ہے۔[1]

ماقبل میں گزر چکا کہ کنایات کی بحث میں جب کہا جاتا ہے کہ اس لفظ میں غیر طلاق

---

[1] (والکنایات ثلاث الخ)حاصله أنها كله تصلح للجواب:أي اجابته لها في سؤالها الطلاق منه،لكن منها قسم يحتمل ردا أيضا أي عدم إجابة سؤالها كأنه قال لها: لاتطلبي الطلاق فإني لا أفعله،وقسم يحتمل السب والشتم دون الرد۔۔۔(تنویر الأبصار مع الدر المختار، کتاب الطلاق،باب الکنایات،ج:۳،ص:۲۹۸-۳۰۲،ط:سعید)

کا بھی احتمال ہے تو اس ''غیر'' سے یہی ''سب وشتم'' یا ''رد'' کا معنی مراد ہوتا ہے۔ اور جس کنائی لفظ میں ان دونوں میں سے کوئی احتمال نہیں ہوتا، وہ جواب کے لیے متعین ہوتا ہے۔

جواب کا مطلب گزر چکا ہے کہ شوہر نے مطالبۂ طلاق کے جواب میں طلاق دے دی ہے۔ ''رد'' کا مطلب طلاق کے مطالبے کو مسترد کرنا ہے، چاہے مطالبہ بیوی کی طرف سے ہو یا کسی اور کی طرف سے ہو۔ ''سب وشتم'' سے مراد کوئی ایسا کلمہ ہے جس سے بیوی کی توہین یا تذلیل کا پہلو نکلتا ہو۔ مثالوں سے تینوں قسم کے الفاظ کی اچھی وضاحت ہوجائے گی، مثلاً ''اخرجی'' (نکل) کا اگر یہ مطلب ہے کہ یہاں سے نکل، تا کہ جھگڑا دفع اور شر رفع ہو تو یہ سوال کا رد ہوا، اور اگر مطلب یہ ہے کہ نکل میرے گھر سے، اس لیے کہ میں طلاق دے چکا ہوں تو یہ طلاق کے سوال کا جواب ہے۔ ''اذھبی'' کا یہ مطلب بھی ہوسکتا ہے کہ چلی جا اور اپنا کام کاج کر اور یہ مفہوم بھی نکلتا ہے کہ مجھ سے بائنہ ہوچکی ہو۔ ''تقنعی'' کا ایک مطلب یہ ہے کہ اپنے چہرے پر نقاب ڈالو، تا کہ کوئی اجنبی تمہیں نہ دیکھے اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ میں تمہیں نہ دیکھ سکوں، کیونکہ میرے لیے اب تم حلال نہیں ہو۔ اسی طرح کے احتمالات ''اخرجی'' سے ملتے جلتے الفاظ'' **تخمری، استتری، انتقلی، انطلقی، اغربی**'' وغیرہ میں بھی نکلتے ہیں۔ [1]

''**خلیة**'' اور اس کے مانند دوسرے الفاظ جیسے '**بریة، بائن، بتة، بتلة**' وغیرہ میں جواب کے ساتھ سب وشتم کا بھی احتمال ہے، مگر رد کا احتمال نہیں ہے، مثلاً ''**خلیة**'' کا یہ مطلب بھی ہوسکتا ہے کہ تو خوبیوں اور کمالات سے خالی اور سراپا ننگ وعار ہے اور یہ

---

[1] قوله: (فنحو اخرجی واذھبی وقومی) أی من ھذا المکان لینقطع الشر فیکون ردا أو لأنه طلقھا فیکون جوابًا، رحمتی۔ (ردالمحتار، کتاب الطلاق، باب الکنایات، ج:۳، ص:۲۹۸، ط:سعید)

احتمال بھی ہے کہ تو نکاح سے خالی ہے، اول احتمال سب وشتم کا اور ثانی طلاق کا ہے۔ اسی پر'' خلیة'' کے بقیہ مترادفات ''انتقلی، انطلقی'' وغیرہ کو بھی قیاس کر لیجیے۔[1]

''فارقتک، أمرک بیدک، اختاری، أنت حرة، أنت واحدة'' وغیرہ ایسے الفاظ ہیں جن میں جواب بننے کی صلاحیت ہے، مگر رد اور سب کا احتمال نہیں ہے، مثلاً: ایک احتمال یہ کہ ''تجھے اس مکان میں چھوڑا'' تو یہ طلاق نہیں ہے اور یہ احتمال کہ ''تجھے طلاق دی اس لیے چھوڑا'' طلاق ہے۔[2]

تینوں قسم کے الفاظ اور حالات کے بیان کے بعد اب کنایات سے طلاق کے وقوع اور عدمِ وقوع کا سمجھنا آسان ہے۔

رضامندی کی حالت میں کنایہ سے اس وقت طلاق واقع ہوگی، جب شوہر کی نیت طلاق دینے کی ہو، کیوں کہ لفظ میں طلاق کے علاوہ غیر طلاق کا بھی احتمال ہے اور کوئی قرینہ ایسا موجود نہیں ہو جو طلاق پر دلالت کرتا ہو، اس لیے بدون نیت طلاق واقع کرنے کی کوئی وجہ نہیں، چنانچہ شوہر سے اس کی نیت دریافت کی جاتی ہے، اگر وہ بیان کرے کہ اس کا ارادہ ومقصد طلاق دینے کا نہ تھا اور اس پر حلف بھی اٹھالیتا ہے تو اس کی بات کا اعتبار کیا جائے گا، مگر شوہر کا حلف اٹھانا لازمی ہے، چاہے بیوی کا دعویٰ طلاق

---

[1] أی خالیة عن النکاح أو عن الخیر......أی فھو علی الأول جواب وعلی الثانی سب وشتم.(ردالمحتار، ۲۹۸/۳، ط:سعید)

[2] فارقتک لأنی طلقتک أو فی ھذا لامنزل(أیضا)فإن کانت حالة الرضا وابتدأ الزوج بالطلاق دین فی القضاء فی جمیع الألفاظ لما ذکرنا أن کل واحد من الألفاظ یحتمل الطلاق وغیرہ والحال لا یدل علی أحدھما فیسئل عن نیته ویصدق فی ذالک قضاءً۔(بدائع الصنائع، کتاب الطلاق، ۱۰۶/۳)

کا ہو یا نہ ہو، البتہ بیوی اندرونِ خانہ ہی شوہر سے حلف لے سکتی ہے اور اگر شوہر حلف اُٹھانے سے انکار کردے تو بیوی کو معاملہ عدالت تک لے جانا چاہیے۔

غصے کی حالت جذبات کی بے اعتدالی کی حالت ہوتی ہے، اس لیے شوہر سے کوئی بھی اقدام بعید نہیں ہوتا ہے، کبھی وہ طلاق کا ہتھیار استعمال کر لیتا ہے، کبھی بدکلامی اور بدزبانی پر اتر آتا ہے تو کبھی طلاق کے مطالبے کو مسترد کر دیتا ہے۔ اب اگر غصے کی حالت میں شوہر نے طلاق اور گالی کا احتمال رکھنے والا لفظ استعمال کیا ہے تو غصے کے قرینے سے کسی ایک جانب کو متعین نہیں کر سکتے ہیں، کیونکہ غصے میں دونوں کام کیے جاتے ہیں، اس لیے شوہر کی نیت دریافت کی جائے گی، اگر اس نے طلاق کی نیت کا انکار کیا تو اس کی تصدیق کی جائے گی، کیونکہ لفظ میں گالی کا مطلب بھی پایا جاتا ہے اور اس کی ظاہری حالت سے بھی اس کی نیت کی تردید نہیں ہوتی ہے۔

اگر اس نے غصے میں طلاق اور رد کا احتمال رکھنے والا کنایہ استعمال کیا ہے تو بھی اس کی نیت پوچھی جائے گی، کیونکہ غصے میں جہاں یہ امکان ہے کہ اس نے طلاق دے کر غصہ اتار دیا ہو، وہاں یہ احتمال بھی ہے کہ اس نے بیوی کے طلاق مانگنے پر اُسے جھڑک دیا ہو، اس قسم کے الفاظ میں بھی غصہ دونوں کا مساوی احتمال رکھتا ہے، اس لیے طلاق کا ہونا شوہر کی نیت پر موقوف ہوگا۔

اگر شوہر نے غصے میں ایسا لفظ استعمال کیا ہے جو صرف جواب یعنی طلاق کے لیے متعین ہے تو طلاق واقع ہے اور شوہر کی نیت پوچھنے کی ضرورت نہیں۔ اگرچہ کنایہ میں غیر طلاق کی گنجائش ہوتی ہے، مگر اس غیر سے مراد سب وشتم اور رد کا معنی ہوتا ہے، جب کہ جو لفظ جواب کے لیے متعین ہو اس میں سب وشتم اور رد کا احتمال ہی نہیں ہوتا اور

جب یہ احتمال زائل ہوجاتا ہے تو طلاق کا احتمال متعین ہوجاتا ہے اور غصے کے قرینے سے طلاق ہونے کا حکم دے دیا جاتا ہے۔

حالتِ مذاکرہ میں اگر شوہر صرف جواب کا احتمال رکھنے والا لفظ استعمال کرے تو بلا نیت طلاق واقع ہے، کیونکہ لفظ طلاق کا ہے اور مطالبہ بھی طلاق کا ہے اور مطالبے پر طلاق دینا قرین قیاس ہے۔ اسی طرح جس لفظ میں جواب کے ساتھ سب وشتم کا احتمال ہو وہ بھی طلاق کے لیے سمجھا جائے گا، کیونکہ خوشگوار ماحول میں یہ غیر معقول معلوم ہوتا ہے کہ شوہر گالی گلوچ اور بدکلامی پر اتر آیا ہو، البتہ جس لفظ میں طلاق کے ساتھ رد کا بھی احتمال ہے، اس میں شوہر کی نیت دیکھی جائے گی، کیونکہ ہوسکتا ہے کہ شوہر نے طلاق کا مطالبہ یکسر مسترد کردیا ہو اور یہ بھی بعید نہیں کہ اس نے طلاق دے دی ہو، اس لیے مذاکرے کی حالت کو تو فیصلہ کن حیثیت نہیں دی جاسکتی، البتہ شوہر کی نیت کو حکم کے لیے مدار بنایا جائے گا۔[1]

---

[1] ”فالحالات ثلاث:رضًاوغضب ومذاکرة،والکنایات ثلاث:ما یحتمل الرد،أو ما یصلح للسب،أولا ولا (فنحو،اخرجی واذھبی وقومی) تقنعی،تخمری،استتری،انتقلی، انطلقی،اغربی،من الغربة أو من العزوبة (یحتمل ردًا،ونحو:خلیة،بریة حرام،بائن) ومرادفھا کبتة بتلة (یصلح سبا،ونحو :اعتدی،واستبرئی رحمک، أنت واحدة، أنت حرة، اختاری،أمرک بیدک، سرحتک،فارقتک لایحتمل السب والرد، ففی حالة الرضا)أی: غیر الغضب والمذاکرة (تتوقف الأقسام) الثلاثة تاثیرا(علی النیة) للاحتمال،والقول له بیمینه فی عدم النیة،ویکفی تحلیفھاله فی منزله،فإن أبی رفعته للحاکم،فإن نکل فرق بینھما، مجتبی،(وفی الغضب)توقف(الأولان)إن نوی وقع وإلا لا(وفی مذاکرة الطلاق) یتوقف (الأول فقط)ویقع بالأخیرین وإن لم ینو، لأن مع الدلالة لا یصدق قضاءً فی نفی النیة لأنھا أقوی،لکونھا ظاھرة والنیة باطنة، ولذا تقبل بینتھا علی الدلالة لا علی النیة، إلا أن تقام علی إقراره بھا،عمادیة۔(تنویر الأبصار مع الدر المختار،کتاب الطلاق،باب الکنایات،ج:۳،ص:۳۰۲،۲۹۸،ط:سعید)

کنایہ کی شناخت کے طریقے

چوتھا فائدہ

کنایہ کی شناخت کے طریقے

کنایہ پر تفصیل سے گفتگو ہو چکی ہے، مگر جتنی ہوئی ہے اس سے زیادہ کی ضرورت ہے، کیونکہ اصل دِقت کنایہ کے حل میں پیش آتی ہے۔ اس ضرورت کے پیش نظر کنایہ پر مختلف زاویوں سے گفتگو مناسب معلوم ہوتی ہے۔

اس فائدے میں کنایہ کی پہچان کے متعلق چند ایسے نکات کا بیان ہے، جس سے کنایہ کی معرفت سہل اور اس کی شناخت کچھ آسان ہو جاتی ہے۔ کنایہ کی شناخت کا بڑا اور مؤثر ذریعہ تو خود اس کی تعریف ہے، کیونکہ تعریف سے شئے کا صاف اور واضح تصور حاصل ہو جاتا ہے، اس کی اساسی صفات اور جوہری اوصاف معلوم ہو جاتے ہیں اور وہ دوسری اشیا سے متمیز اور ممتاز ہو جاتی ہے۔

منطقی حضرات کہتے ہیں کہ جنس اور فصل کے بیان سے شئ کی اصلیت معلوم ہوتی ہے اور اس کی حقیقت کھل کر اور نکھر کر سامنے آجاتی ہے، مگر ہمیں ان جھمیلوں میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔ بہتر اور مفید طریقہ فقہا کا اور ان میں بھی اگلے فقہا کا ہے، کیونکہ ان کی

عبارتیں سادگی اور برجستگی میں بے مثل، تکلف سے پاک، بلاغت کا اعلیٰ نمونہ اور معنویت سے بھرپور ہوتی ہیں، چنانچہ ہم کنایہ کی تعریف پر ایک مرتبہ پھر نظر ڈالتے ہیں۔

کنایہ کی جو تعریف ماقبل میں بیان ہوئی، اس کا حاصل دو باتیں ہیں:

۱:...... کنایہ اصل میں طلاق کے لیے وضع نہیں ہوتا ہے۔

۲:...... کنایہ میں طلاق کے ساتھ غیر طلاق کی بھی گنجائش ہوتی ہے۔

اس تعریف کا پہلا جز سلبی ہے اور سلبی تعریف ہماری معلومات میں کوئی مفید اضافہ نہیں کرتی، کیونکہ ہمیں ضرورت ''کوئی شئے کیا نہیں ہے؟'' کی نہیں ہے بلکہ ''کوئی شئے کیا ہے؟'' کی ہے۔ شارحین کو اللہ تعالیٰ نیک جزادے کہ انہوں نے ایجابی پہلو سے بھی مذکورہ جملے کی مراد کو واضح کر دیا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ کچھ کنایات ایسے ہیں جن کا معنی طلاق کے معنی سے زیادہ عام ہے اور مثال میں ''اعتدی، استبرئی رحمک، أنت واحدۃ'' تینوں رجعی کنایہ الفاظ کو پیش کرتے ہیں اور بقیہ کنائی الفاظ ایسے ہیں کہ ان کا حکم طلاق کے حکم سے زیادہ عام ہے، اس طرح کنایہ الفاظ دو قسموں میں تقسیم ہو جاتے ہیں، دونوں قسموں کو مدنظر رکھتے ہوئے حاصل یہ نکلتا ہے کہ کنایہ اپنی وضع میں طلاق کے معنی اور حکم سے زیادہ عموم رکھتا ہے اور اس میں طلاق کی بہ نسبت وسعت زیادہ ہوتی ہے۔ ''اعتدی'' کے لفظ پر غور کرنے سے صاف محسوس ہوتا ہے کہ یہ طلاق کے لفظ کے مقابلے میں ایک اضافی مفہوم پر مشتمل ہے، طلاق کا لفظ تو صرف طلاق کا جب کہ ''اعتدی'' طلاق کے علاوہ کا بھی مفہوم رکھتا ہے، یہی حال دیگر کنایات کا بھی ہے:

"...المقصود تنويع الكناية إلى نوعين: الأول ماهو أعم من الطلاق وهو الألفاظ الثلاث، والثاني ماهو أعم من حكمه، وهو

باقی الألفاظ...''[1]

''قوله: كأنت بائن... هذه الألفاظ كلها تدل على معنى زائد علىٰ نفس الطلاق ويحتمله وغيره...''[2]

کنایہ کی تعریف کا دوسرا جز یہ ہے کہ وہ طلاق اور غیر طلاق دونوں مفہوم رکھتا ہے۔ پیچھے نہایت زور اور تاکید دے کر واضح کیا گیا تھا کہ طلاق کے مفہوم سے مراد جواب کا معنی ہے اور جواب کا مطلب ہے کہ شوہر نے طلاق دے ڈالی ہے۔ محیط برہانی میں ایک بڑا اچھا ضابطہ مذکور ہے، جس سے جواب کی صلاحیت رکھنے والے الفاظ کی پہچان آسان ہو جاتی ہے:

''إذا ثبت هذا فنقول: في هذه الألفاظ إيجاب حكم الطلاق، وهو ماثبت بالطلاق من غير فعل فاعل مختار، والبينونة والحرية والخلع عن النكاح (البراءة عن النكاح) يثبت بنفس الطلاق من غير فعل فاعل مختار فكانت هذه الألفاظ صالحة للجواب من هذاالوجه۔''[3]

ترجمہ:...... ''جب یہ بات پایۂ تحقیق تک پہنچ گئی تو ہم کہتے ہیں کہ ان الفاظ میں طلاق کے حکم کا اثبات ہے اور طلاق کا حکم یہ ہے کہ طلاق سے بدون کسی فاعل مختار کے فعل ثابت ہو۔ بینونت، حریت اور نکاح سے بریت

---

[1] عمدة الرعاية على شرح الوقاية، كتاب الطلاق، فصل في كنايات الطلاق، ۲۸۱/۳، ط: دار الكتب العلمية، بيروت

[2] عمدة الرعاية على شرح الوقاية، كتاب الطلاق، فصل في كنايات الطلاق، ۲۸۱/۳، ط: دار الكتب العلمية، بيروت

[3] المحيط البرهانى، كتاب الطلاق، الفصل الخامس في الكنايات، ج:۴، ص:۴۲۸، ط: إدارة القرآن كراچی

وغیرہ ایسے احکام ہیں جو طلاق سے کسی بااختیار فاعل کے فعل کے بغیر ثابت ہوجاتے ہیں، اس پہلو سے یہ الفاظ طلاق کی صلاحیت رکھتے ہیں۔“

مطلب یہ ہے کہ لفظ اگر ایسا ہے کہ اس سے طلاق کا نتیجہ خود بخود ثابت ہوجاتا ہے اور اس نتیجے کو وجود میں لانے کے لیے کسی بااختیار شخص کے فعل کا واسطہ ضروری نہیں تو وہ جواب کا لفظ ہے، مثلاً: شوہر کہتا ہے: ”پردہ کر“ پردے کا فعل وجود میں لانے کے لیے بیوی کے فعل کی ضرورت ہے، اس پہلو سے یہ جواب کا لفظ نہیں، مگر اس زاویے سے کہ طلاق کے بعد بیوی غیر محرم ہوجاتی ہے اور پردہ واجب ہوجاتا ہے اور اس حرمت کے ثبوت کے لیے کسی کے فعل کی حاجت نہیں ہوتی، یہ جواب کا لفظ ہے۔

شامی میں کنز کے شارح شیخ ابوالسعودؒ کے حوالے سے ایک بحث منقول ہے، جو اصل میں ایک خاص لفظ (یمین) کے متعلق ہے، مگر اس کے ضمن میں کچھ ایسی عبارتیں زیر بحث آگئی ہیں، جو ہماری بحث میں مفید ہیں اور ان سے کنایہ کی پہچان میں مدد اور راہنمائی ملتی ہے:

”...ماذكروه في تعريف الكناية ليس على إطلاقه، بل هو مقيد بلفظ يصح خطابها به، ويصلح لإنشاء الطلاق الذي أضمرهٗ أو للإخبار بأنهٗ أوقعه كأَنْتِ عَلَيَّ حرام، إذ يحتمل لأني طلقتك أو حرام الصحبة وكذا بقية الألفاظ ......فليس كل ما احتمل الطلاق من كنايته بل بهذين القيدين، ولابد من ثالث هو كون اللفظ مسببًا عن الطلاق وناشئًا عنه كالحرمة في أنت على حرام، ونقل في البحر عدم الوقوع، بلا أحبك، لا اشتهيك، لا رغبة لي فيك وإن نوى، ووجههٗ أن معاني هذه الألفاظ ليست ناشئة عن الطلاق، لأن الغالب الندم بعدهٗ فتنشأ المحبة والاشتهاء والرغبة،

بخلاف الحرمة......"[1]

مذکورہ بالا عبارت میں صراحت ہے کہ فقہا سے کنایہ کی جو تعریف منقول ہے وہ علی الاطلاق نہیں، بلکہ تین شرائط کے ساتھ مشروط ہے

۱:......لفظ ایسا ہو کہ اس سے بیوی کو مخاطب کرنا درست ہو۔

۲:......اس میں انشاء یا خبر بننے کی صلاحیت ہو۔

۳:......اور اُسے طلاق کا نتیجہ اور حکم قرار دینا درست ہو۔

لفظ حرام ان تینوں شرطوں کا جامع ہے، اس لیے کنایہ ہے، کیوں کہ بیوی کے متعلق ''تو مجھ پر حرام ہے'' کے الفاظ استعمال کرنا درست ہے۔ شوہر طلاق دے چکا ہے یا ابھی اس نے بیوی اپنے اوپر حرام کردی ہے، اس معنی کے لحاظ سے یہ خبر یا انشاء ہے، اور طلاق کے سبب بیوی اس پر حرام ہے، اس پہلو سے یہ طلاق کے نتیجے اور ثمرے کا بیان ہے۔ اس کے برعکس جب شوہر بیوی کو باپ کہہ کر پکارتا ہے تو اس لفظ سے بیوی کو مخاطب بنانا درست ہے، نہ ہی اُسے طلاق کی خبر قرار دینا معقول ہے اور نہ ہی اُسے طلاق کا نتیجہ اور بیان بنایا جاسکتا ہے، اس وجہ سے طلاق بھی واقع نہیں، کیونکہ لفظ طلاق کا لفظ ہی نہیں۔

کنایہ کی معرفت کا دوسرا طریقہ کتب فتاویٰ کی مراجعت ہے۔ اردو فتاویٰ کا دامن کنایہ الفاظ سے بھرا ہوا ہے اور ان میں ایک بڑا ذخیرہ موجود ہے۔ شاذ و نادر ایسا ہوتا ہے کہ شوہر کوئی کنایہ استعمال کرے اور اردو فتاویٰ اس کے ذکر سے خالی ہوں۔

عرف سے واقفیت اور اس سے بھرپور معرفت تو سب سے بڑا اور اہم عامل

---

[1] ردالمحتار، کتاب الطلاق، باب الکنایات، ج:۳، ص:۲۹٦، ط:سعید

ہے۔آج کل کے زیادہ مروج اور کثیر الاستعمال الفاظ فارغ،آزاد، حرام، چھوڑ دیا، الگ کردیا،تو میری بیوی نہیں، میرا تیرا تعلق نہیں، چل، جا،نکل، ہٹ،سرک، دفع ہوجا، تو مجھ پر ماں بہن ہے،جہنم میں جا، بھاڑ میں جا، اپنے لیے کوئی اور ڈھونڈ لے،نہیں رکھتا، تجھے نہیں چاہتا، میری طرف سے جواب ہے، فیصلہ ہے، میرا تیرا کوئی رشتہ نہیں، میرے کام کی نہیں، میں تیرا شوہر نہیں،تو جانے اور تیرا کام، اسے لے جاؤ، اپنی لڑکی لے جاؤ، والدین کے گھر ہی رہو، میاں بیوی والا تعلق ختم کردیا، میری بیوی نہ رہی، تجھے رکھوں تو ماں و بہن کو رکھوں، طلاق سمجھو، چھٹی کر، وغیرہ ہیں۔

یہ کنایات کی مکمل فہرست نہیں ہے، جو باقی ہیں وہ اس سے زیادہ ہیں، یہی کثرت ہے جس کی دہشت سے ذہن مرعوب اور طبیعت خائف رہتی ہے، مگر اصل حقیقت یہ ہے کہ مترادفات کی کثرت کی وجہ سے کنایہ کی فہرست طویل ہوجاتی ہے۔اوپر جو الفاظ مذکور ہوئے، ان پر غور کیجیے تو بہت سے الفاظ ہم معنی ہیں، مثلاً: ”فیصلہ، جواب، ختم، چھٹی اور فائنل وغیرہ کے الفاظ اور ”جدا کردیا، الگ کردیا، علیحدہ کردیا، وغیرہ ملتے جلتے الفاظ ہیں، صرف الفاظ الگ اور تعبیر مختلف ہے، ورنہ مطلب ومفہوم ایک ہے۔

اس کے علاوہ مذکورہ الفاظ میں سے بعض تو کنایہ کے الفاظ ہی نہیں اور بعض سے طلاق کا ہونا شرط کے ساتھ مشروط ہے اور بعض شرط کے ساتھ نیت کے بھی محتاج ہیں، البتہ چند ایسے ہیں جو صریح ہیں اور نیت کے محتاج نہیں۔

مزید یہ کہ کنایات گنتی میں زیادہ ضرور ہیں، مگر تجربہ اور مشاہدہ ہے ایک مخصوص علاقے کے رہائشی اور ایک خاص برادری کے افراد چند مخصوص اور گنے چنے الفاظ ہی استعمال کرتے ہیں، لہٰذا معدودے چند الفاظ جو کثرت سے استعمال ہوتے ہوں، ان پر گرفت اور ان کا ضبط زیادہ مشکل نہیں۔

صریح سے ملحق الفاظ

پانچواں فائدہ

صریح سے ملحق الفاظ

کنایہ، طلاق کے لفظ سے زیادہ وسیع مفہوم رکھتا ہے اور اپنے اصل کے لحاظ سے نیت کا بھی محتاج ہوتا ہے اور اس سے واقع ہونے والی طلاق بھی اکثر و بیشتر بائن ہوتی ہے، مگر جب کنایہ کا استعمال کثرت سے طلاق کے لیے ہونے لگتا ہے تو وہ صریح کے درجے میں آجاتا ہے اور اس کا عرفی استعمال ہی نیت کے قائم مقام ہوجاتا ہے اور اس سے بلا نیت طلاق واقع ہونے لگتی ہے، ایسا کنایہ جو عرف کی وجہ سے صریح بن جائے ''ملحق بالصریح'' کہلاتا ہے، حرام، آزاد اور چھوڑ دیا وغیرہ الفاظ اس کی مثالیں ہیں۔ ملحق بالصریح سے اگر رجعی واقع ہو تو وہ ''صریح کنایہ رجعی'' اور بائن واقع ہو تو وہ ''صریح کنایہ بائن'' کہلاتا ہے۔

ملحق بالصریح کے متعلق اہم نکتہ یہ ہے کہ صریح سے لحوق کے بعد اس میں صرف نیت کی شرط ختم ہوئی ہے، دیگر احکام میں یہ اپنی اصل پر ہے اور اس پر کنایہ کے احکام

لاگو ہیں۔ الجھن اور پیچیدگی اس وقت پیدا ہوتی ہے جب اُسے ہر حیثیت اور تمام وجوہ سے صریح قرار دے دیا جاتا ہے:

"وألفاظه: صریح، وملحق به، وکنایة، وفی الرد (قوله وملحق به) أی من حیث عدم احتیاجه إلی النیة کلفظ التحریم۔"[1]

"قال لأمرته أنت علی حرام ونحو ذلک۔۔۔۔ ویفتی بأنه طلاق بائن (وإن لم ینوه) لغلبة العرف۔"[2]

۲:...... طلاق کا لفظ صریح ہے اور ہمارے عرف میں اس کا کلی اور سو فیصدی استعمال طلاق کے لیے ہوتا ہے، مگر ملحق بالصریح اپنے ہر استعمال میں طلاق کے لیے نہیں ہوتا ہے۔ صریح کی جو تعریف ماقبل میں گزری، اس سے خود یہ لچک معلوم ہو رہی ہے، کیونکہ غالب استعمال کا مطلب ہے کہ اس میں قلیل ہی سہی، مگر غیر طلاق کی بھی گنجائش ہوتی ہے۔ لوگوں کا عرف بھی اس پر شاہد ہے کہ وہ ملحق بالصریح کا استعمال طلاق کے علاوہ مطلب کے لیے بھی کرتے ہیں، مثلاً: "تم آزاد ہو جو چاہو پہنو" یا بیوی دامن چھڑانے لگے اور کہے "چھوڑ دو" اور شوہر کہے "چھوڑ دیا" البتہ جب ملحق بالصریح کا استعمال طلاق کے علاوہ معنی کے لیے ہوتا ہے تو وہاں کوئی لفظی یا معنوی قرینہ ایسا موجود ہوتا ہے جو عدمِ طلاق پر دلالت کرتا ہے، جیسا کہ سابقہ مثالوں میں "پہنو" اور "دامن کا چھڑانا" عدمِ طلاق کے قرائن ہیں۔

مقصد یہ ہے کہ صریح کنایہ کے استعمال کے وقت لفظی اور معنوی قرائن کو بھی زیرِ غور لانا چاہیے۔ اگر کوئی قرینہ حالیہ یا مقالیہ عدمِ طلاق پر دلالت کرتا ہو تو محض اس وجہ سے طلاق واقع نہیں قرار دی جائے گی کہ شوہر صریح لفظ زبان پر لایا ہے۔

---

[1] ردالمحتار علی الدر، کتاب الطلاق، ج:۳، ص:۲۳۰، ط:سعید

[2] ردالمحتار علی الدر، کتاب الطلاق، ج:۳، ص:۲۳۴، ط:سعید

اس بحث سے ظاہر ہے کہ ملحق بالصریح سے طلاق کا وقوع غیر مشروط نہیں ہے اور یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ ملحق بالصریح، صریح ضرور ہے، مگر بہمہ وجوہ صریح کے حکم میں نہیں۔ ذیل میں ''امداد الاحکام'' کا ایک اقتباس درج کیا جاتا ہے، جس سے ہمارے مقصد کی اچھی طرح وضاحت ہوجاتی ہے۔

''واضح رہے کہ کنایہ وہ ہوتا ہے جس میں احتمال رفع قید نکاح بھی ہو اور اس کے غیر کا احتمال بھی ہو، اور لفظ ''آزاد'' ہر حالت میں اور ہر استعمال میں کنایہ طلاق نہیں، بلکہ یہ کنایات میں اس وقت داخل ہوگا جب کہ خلافِ ارادہ طلاق کا قرینہ کلام میں نہ ہو، مثلاً: یوں کہا جائے ''میری بیوی آزاد ہے'' یا ''تو آزاد ہے'' یا ''وہ آزاد ہے'' اور ''ہر طرح مجھ سے آزاد ہے''، ''تو پوری طرح آزاد ہے'' ان استعمالات میں بیشک یہ کنایات کی قبیل سے ہے اور اگر ارادۂ طلاق کا قرینہ قائم ہو تو پھر یہ لفظ صریح ہوجاتا ہے، مثلاً: یوں کہا جائے کہ ''میری بیوی میرے نکاح سے آزاد ہے'' یا ''میں نے اس کو اپنے نکاح سے آزاد کردیا''۔ اور اگر کلام میں عدمِ ارادۂ طلاق کا قرینہ قائم ہوجائے تو پھر یہ نہ صریح طلاق سے ہے نہ کنایات سے، مثلاً: یوں کہا جائے کہ ''تو آزاد ہے جو چاہے کھا پی''، ''میں نے اپنی بیوی کو آزاد کیا، چاہے میرے پاس رہے یا اپنے گھر''، ''وہ آزاد ہے جب اس کا جی چاہے آوے'' ان استعمالات میں ہرگز کوئی شخص محض مادہ ''آزاد'' کی وجہ سے اس کلام کو کنایہ طلاق سے نہیں کہہ سکتا، بلکہ اباحتِ افعال وتخییر وغیرہ پر محمول کرے گا، بشرطیکہ اس کو محاوراتِ لسان پر کافی اطلاع ہو، اور ایک لفظ کا صریح طلاق ہونا اور کنایہ طلاق ہونا اور گاہے دونوں سے خالی ہونا اہل علم پر مخفی نہیں۔'' [1]

---

[1] امداد الاحکام، ج: ۳، ص: ۴۰۷-۴۱۷، ط: دار العلوم کراچی

صریح رجعی اور صریح بائن کا فرق

چھٹا فائدہ

صریح رجعی اور صریح بائن کا فرق

صریح سے رجعی بھی واقع ہوتی ہے اور بائن بھی، مگر ملحق بالصریح سے کس نوع کی طلاق واقع ہوگی؟ بالفاظِ دیگر صریح رجعی اور صریح بائن کے درمیان فرق کا معیار کیا ہے؟ اس فائدے کا مقصد اسی سوال کا جواب تلاش کرنا ہے۔

کچھ فقہا کا خیال ہے کہ جب کوئی لفظ صریح کے درجے میں آجائے تو اس کا حکم بھی صریح کا ہونا چاہیے اور اس سے طلاقِ رجعی واقع ہونی چاہیے۔ شامی میں لفظ ''سن بوش'' کے متعلق اسی قسم کا اختلاف مذکور ہے، یہ ترکی زبان کا لفظ ہے اور ''خلیة'' اور ''خالیة'' کے معنی میں ہے، علامہ شامیؒ نے کئی مشایخ کے حوالے سے اس سے طلاق رجعی کا واقع ہونا نقل کیا ہے:

> "قال فی الشرنبلالیة: وقع السؤال عن التطلیق بلغة الترک هل هو رجعی باعتبار القصد أو بائن باعتبارمدلول "سن بوش" أو "بوش اول" لأن معناها خالیة أو خلیة، فینظر ، قلت: أفتی

الرحيمي تلميذ الخير الرملي بأنه رجعي وقال كما أفتى به شيخ الإسلام أبو السعود ونقل مثله شيخ مشايخنا التركماني عن فتاوى على آفندى مفتي دار السلطنة وعن الحامدية''۔ [1]

یہ حوالہ اس لحاظ سے تو ہمارے مقصد کے لیے مفید ہے کہ ایک خاص لفظ کے متعلق ہمیں مشایخ کا نقطہ نظر اور کسی حد تک علامہ شامیؒ کا ذاتی رجحان معلوم ہو جاتا ہے، مگر اس پہلو سے غیر مفید ہے کہ ہمیں کوئی ایسا عمومی اور کلی اصول ہاتھ نہیں آتا، جس سے اس نوع کے تمام الفاظ کا حکم معلوم ہو سکے اور اُنہیں ایک قاعدے کے تحت منضبط کیا جا سکے۔عبارت کی تمہیدی سطروں میں علت کی طرف اشارہ ضرور ہے، مگر تا اختتام کسی فیصلے کا بیان نہیں ہے۔

''حرام'' کے لفظ کے تحت ''درمختار'' کے شارحین نے جو بحث کی ہے اس سے ہماری تشنگی دور ہو جاتی ہے، کیوں کہ وہ علت کے بیان پر مشتمل ہے، مثلاً: علامہ طحطاویؒ لکھتے ہیں:

''(قوله:لغلبة العرف) هٰذا جواب سوال مقدر حاصله إذا وقع الطلاق بلا نية ينبغي أن يكون كالصريح فيكون الواقع به رجعيًا، والجواب أن المتعارف به إيقاع البائن۔'' [2]

ترجمہ:...... ''غالب عرف کی وجہ سے'' یہ ایک سوال مقدر کا جواب ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ جب اس لفظ سے بلا نیت طلاق واقع ہوئی تو اُسے صریح کی طرح ہونا چاہیے اور اس بنا پر اس سے طلاق رجعی ہونی چاہیے؟

---

[1] ردالمحتار، كتاب الطلاق باب الصريح، مطلب ''سن بوش، يقع به الرجعي ج:٣، ص:٢٤٨، ط:سعيد،

[2] حاشية الطحطاوى على الدر المختار، ج:٢، ص:١٨٤، ط:رشيديه كوئٹه

جواب یہ ہے کہ عرف میں اس سے طلاقِ بائن دینے کا رواج ہے۔‘‘

اس عبارت سے وضاحت کے ساتھ تین باتیں معلوم ہوئیں:

۱:......جس لفظ سے بلا نیت طلاق واقع ہو وہ صریح ہے۔

۲:......صریح سے طلاق رجعی واقع ہوتی ہے۔

۳:......اگر عرف میں صریح سے طلاق بائن دینے کا معمول ہو تو پھر اس سے طلاق بائن ہی واقع ہوگی۔

بہر حال شیخ طحطاویؒ کا کلام اس بارے میں فیصلہ کن ہے کہ مدار عرف پر ہے، مگر علامہ شامیؒ اس سے اختلاف رکھتے ہیں، ان کے نزدیک نفس طلاق تو عرف کی وجہ سے واقع ہے، مگر اس کا بائن ہونا عرف کی وجہ سے نہیں بلکہ خود لفظِ حرام کی وجہ سے ہے، کیونکہ اس لفظ کا مقتضٰی ہی یہی ہے کہ اس سے بائن واقع ہو، شامی کی عبارت یہ ہے:

”أقول: وفي هذا الجواب نظر، فإنه يقتضي أنه لو لم يتعارف به إيقاع البائن يقع به الرجعي كما في زماننا، فإن المتعارف الآن استعمال الحرام في الطلاق ولا يميزون بين الرجعي والبائن فضلا عن أن يكون عرفهم فيه البائن، وعلى هذا فالتعليل بغلبة العرف لوقوع الطلاق به بلا نية، وأما كونه بائنا فلأنه مقتضٰى لفظ الحرام، لأن الرجعي لا يحرم الزوجة مادامت في العدة وإنما يصح وصفها بالحرام بالبائن، وهذا حاصل ما بسطناه في الكنايات فافهم“۔ [1]

ترجمہ:......”میں کہتا ہوں کہ یہ جواب محلِ نظر ہے، کیوں کہ اس کا تقاضا تو یہ ہے کہ اگر عرف میں اس سے بائن دینا متعارف نہ ہو تو اس سے رجعی

---

[1] ردالمحتار علی الدر المختار، ج:۳، ص:۴۳۵، ط: سعید

واقع ہونی چاہیے، جیسا کہ ہمارے زمانے کا حال ہے، کیونکہ آج کل کے عرف میں حرام کا استعمال طلاق کے لیے ہوتا ہے، مگر لوگ رجعی اور بائن کے درمیان فرق نہیں کرتے، چہ جائیکہ ان کا عرف طلاق بائن کا ہو، اس بنا پر ''غلبۂ عرف'' کا لفظ طلاق کے وقوع کی علت ہے، رہا طلاق کا بائن ہونا تو وہ اس وجہ سے ہے کہ لفظ ''حرام'' کا مقتضا یہی ہے، کیوں کہ رجعی طلاق تو بیوی کو حرام نہیں کرتی جب تک وہ عدت میں ہو، البتہ بائن کے ذریعے ہی اسے حرام سے موصوف کرنا درست ہے، یہ اس طویل بحث کا خلاصہ ہے جو ہم نے کنایات میں کی ہے، خوب سمجھ لیجیے۔''

علامہ شامیؒ کا کلام اپنے مفہوم میں واضح ہے اور اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا بالکل درست ہے کہ لفظ کے مفہوم اور اس کے تقاضوں کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے، یہ وہی اصولی بات ہے جو ''النتف فی الفتاوی'' اور اس کے علاوہ دیگر کتب میں مذکور ہے کہ ''جس لفظ میں نرمی اور خفت ہے، وہ رجعی ہے اور جس میں شدت اور سختی ہے، وہ بائن ہے'':

''أما الطلاق الرجعي فإن كل لفظة فيها لين ولطف، فهو رجعي، وكل لفظ فيه عنف وغلظ، فهو بائن''[1]

اب صرف ایک اشکال باقی رہ جاتا ہے کہ صریح سے بائن کس طرح واقع ہو سکتی ہے؟ شامیؒ نے اس کا جواب اس طرح دیا ہے کہ دونوں میں کوئی تضاد نہیں ہے، صریح سے بھی بائن واقع ہو جاتی ہے، جیسا کہ کنایہ سے رجعی بھی واقع ہوتی ہے:

''...وكونه التحق بالصريح للعرف لا ينافي وقوع البائن به، فإن الصريح قد يقع به البائن كتطليقة شديدة ونحوه، كما أن بعض

---

[1] ردالمحتار علی الدر المختار، ج:٣، ص:٢٠٥، ط:سعید

الكنايات قد يقع به الرجعي، مثل اعتدى واستبرئي رحمك وأنت واحدة، والحاصل أنه لما تعورف به الطلاق صار معناه تحريم الزوجة وتحريمها لا يكون إلا بالبائن، هذا غاية ما ظهر لي في هذا المقام۔" [1]

ان تمام عبارات، اعتراضات اور ان کے جوابات کا خلاصہ اور نچوڑ یہ ہے کہ:

۱:......کنایہ کا استعمال کثرت سے طلاق کے لیے ہونے لگے تو وہ صریح بن جاتا ہے۔

۲:......صریح سے طلاق رجعی واقع ہوتی ہے۔

۳:......اگر صریح ایسا ہے کہ اس کے معنی میں شدت اور سختی ہے اور اس کا مفہوم بائن کا تقاضا کرتا ہے تو پھر اس سے بائن واقع ہوگی۔ یہی فرق ہے جس کی وجہ سے چھوڑنے کے لفظ سے رجعی اور لفظ آزاد اور حرام وغیرہ سے بائن کا فتویٰ دیا جاتا ہے۔

---

[1] ردالمحتار، باب الکنایات، ج:۳، ص:۳۰۰-۲۹۹، ط: سعید

طلاق کا اثر اور نتیجہ

ساتواں فائدہ

طلاق کا اثر اور نتیجہ

یہ فائدہ طلاق کے اثر اور نتیجے کے بیان میں ہے۔ مقصد یہ معلوم کرنا ہے کہ کس لفظ سے کون سی طلاق واقع ہوتی ہے؟

کنایہ وہ ہے جس میں طلاق اور غیر طلاق دونوں کا احتمال ہو، مگر لفظِ طلاق مذکور نہ ہو، کیوں کہ اگر طلاق کا احتمال ہی نہ ہو تو وہ کنایہ ہی نہیں ہے، بلکہ سرے سے طلاق کا لفظ ہی نہیں ہے اور اگر صرف طلاق ہی کا احتمال ہو تو پھر وہ کنایہ نہیں بلکہ صریح ہے اور اگر اس میں طلاق کا لفظ مذکور ہو یا مقدر ہو تو پھر اس سے بائن نہیں بلکہ رجعی واقع ہوتی ہے۔ ''اعتدی'' وغیرہ کنایات سے رجعی واقع ہونے کی وجہ یہ ہے کہ ان میں طلاق کا لفظ موجود ہے، مگر لفظوں سے گرادیا گیا ہے۔ [1]

---

[1] وقال في المنح: إن صحة هذه الألفاظ بالإضمار فإن معنى قول أنت واحدة أنت طالق طلقة واحدة فيصير الحكم للصريح، لكن لا بد من النية ليثبت هذا المضمر الخ۔ (رد المحتار، كتاب الطلاق، باب الكنايات، مطلب الصريح يلحق الصريح والبائن، ج:۳، ص:۳۰۶، ط: سعيد)

کنایہ کے اکثر وبیشتر الفاظ سے طلاق بائن واقع ہوتی ہے، مگر بعض کنایات ایسے ہیں جن سے رجعی واقع ہوتی ہے، جیسے: ’’اعتدی، استبرئی رحمک، أنت واحدۃ‘‘ وغیرہ [۱] اور صریح سے عام حالات میں طلاق رجعی واقع ہوتی ہے، لیکن بعض صورتوں میں اس سے طلاق بائن واقع ہوتی ہے، اسی وجہ سے بدائع میں صریح کو رجعی اور بائن دو قسموں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ [۲] اس فائدہ کا بنیادی مقصد ان صورتوں کو بیان کرنا ہے جن میں صریح سے بائن واقع ہوتی ہے۔ ذیل میں وہ صورتیں بیان کی جاتی ہیں:

۱:......طلاق کسی معاوضے میں دی گئی ہو۔ [۳]

۲:......شوہر خود صراحت کردے کہ وہ طلاق بائن دے رہا ہے۔ [۴]

---

[۱] وأما الكناية فثلاثة ألفاظ من الكنايات رواجع بلا خلاف وهي قوله: اعتدى واستبرئى رحمک وأنت واحدة۔ واختلف فی البواقی من الکنایات فقال أصحابنا رحمهم الله: أنها بوائن۔ (بدائع الصنائع، کتاب الطلاق، فصل: وأما بیان صفة الواقع بها، ج:۳، ص:۱۱۲، ط:سعید)

[۲] مطلب الصريح نوعان: صريح رجعی وبائن، ففی البدائع ان الصريح نوعان: صريح رجعی وصريح بائن۔ (رد المحتار، کتاب الطلاق، باب الصريح، ج:۳، ص:۲۵۰ ط: سعید)

[۳] (قوله وكذا الطلاق على مال) أى إنه أيضا من الصريح وإن كان الواقع به بائنا۔ (رد المحتار، کتاب الطلاق، باب الکنایات، ج:۳، ص:۳۰۷، ط:سعید)

ـــــ ”إن طلقها على مال فقبلت وقع الطلاق ولزمها المال، وكان الطلاق بائنا“۔ (الفتاوى العالمگیریة، الفصل الثالث فی الطلاق علی المال، ج:۱، ص:۴۹۵، ط:رشیدیة

ـــــ (و) حكمه أن (الواقع به) أى بالخلع ولو بلا مال (وبالطلاق) الصريح (على مال طلاق بائن۔ (تنویر مع الدر، کتاب الطلاق، باب الخلع، ج:۳، ص:۴۴۴، ط:سعید

[۴] (و) يقع (ب) قوله (أنت طالق بائن أو البتة) (بائنة) فی الکل۔ (تنویر الابصار مع الدر المختار، کتاب الطلاق، باب الصريح، ج:۳، ص:۲۷۶، ۲۷۷، ط:سعید)

۳:......جس عورت سے صحبت نہ ہوئی ہو، اگر چہ خلوت ہو چکی ہو۔ [۱]

۴:......طلاق بائن کے بعد تجدید نکاح سے پہلے عدت کے اندر صریح طلاق دی ہو۔ [۲]

۵:......جس طلاق سے طلاق کا عدد تین تک پہنچ جائے، وہ بھی بائن بلکہ بائن کی قسمِ اکبر ''بینونتِ کبریٰ'' ہوتی ہے۔ [۳]

---

[۱] صريح الطلاق قبل الدخول يكون بائنا۔ (الفتاوىٰ السراجية، كتاب الطلاق، باب البائن والرجعى، ۴۳، ط:ايچ، ايم، سعيد كراچى)

ـــ ولا رجعة له بعد الطلاق الصريح بعد الخلوة بحر: أى لو وقوع الطلاق بائنا كما قدمناه۔ (البحر الرائق، ج:۳، ص:۱۶۲، ط:رشيديه۔ ردالمحتار، كتاب الطلاق، باب المهر، ج:۳، ص:۱۲۰، ط:سعيد)

ـــ وإذا طلق الرجل امرأته ثلاثا قبل الدخول بها وقعن، فإن فرق الطلاق بانت بالأولى ولم تقع الثانية، والثالثة۔ (الفتاوى الهندية، كتاب الطلاق، الفصل الرابع فى الطلاق قبل الدخول، ج:۱، ص:۳۷۳، ط:رشيدية)

ـــ وأما الصريح البائن فبخلافه وهو أن يكون بحرف الإبانة أو بحروف الطلاق لكن قبل الدخول حقيقة۔ (بدائع الصنائع، كتاب الطلاق، فصل: وأما بيان صفة الواقع بها، ج:۳، ص:۱۰۹، ط:سعيد۔ البحر الرائق، ج:۳، ص:۲۷۵، ط: سعيد)

[۲] واذا لحق الصريحُ البائنَ كان بائناً لأن البينونة السابقة عليه تمنع الرجعة كما فى الخلاصة۔ (كتاب الطلاق، باب الكنايات، مطلب الصريح يلحق الصريح والبائن، ج:۳، ص:۳۰۶، ط:سعيد)

ـــ ولو قال لها: أنت بائن ونوى الطلاق، وقعت واحدة بائنة، ثم قال لها وهى فى العدة ''أنت طالق'' بانت بتطليقتين''۔ (الفتاوى التاتارخانية، كتاب الطلاق، فصل ايقاع الطلاق على المبانة، ج:۴، ص:۵۲۳، ط:مكتبه فاروقيه كوئٹه)

[۳] طلقها رجعية ثم قال فى العدة جعلت هذه التطليقة بائنة أو ثلاثا صح عند أبى حنيفة رحمه الله۔ (رد المحتار، كتاب الطلاق، باب الكنايات، ج:۳، ص:۳۰۵، ط:سعيد)

۶:......طلاق دی اور عدت گزرنے تک رجوع نہ کیا تو صریح طلاق، بائن بن جاتی ہے یا یوں تعبیر کر لیں کہ بیوی بائنہ ہو جاتی ہے۔[۱]

۷:......نکاح کی جو تنسیخ عدالت کی مداخلت سے ہو، وہ بھی بعض صورتوں میں بائن کا حکم رکھتی ہے۔[۲]

۸:......طلاق کے بعد کوئی جملہ ایسا بڑھا دیا جس سے صریح بائن بن جائے، جیسے تمہیں طلاق دے کر اپنی زوجیت سے علیحدہ کرتا ہوں۔[۳]

۹:......کوئی ایسی صفت بڑھا دی جائے جس سے طلاق میں شدت پیدا ہو جائے اور معلوم ہو کہ شوہر فوری طور پر رشتۂ زوجیت ختم کرنا چاہتا ہے، جیسے: ''تمہیں بدترین طلاق، پہاڑ کے برابر طلاق، فاحشہ طلاق، طلاق قطعی، طلاق دائمی دے دی۔''[۴]

---

[۱] فإذا انقضت العدة قبل الرجعة فقد بطل حق الرجعة وبانت المرأة منه۔ (المبسوط للسرخسی، کتاب الطلاق، باب الرجعة، ج:۶، ص:۱۲، ط:مکتبہ حبیبیہ کوئٹہ)

[۲] وإذا رفعت المرأة زوجها إلى القاضی وادعت أنه عنين وطلب الفرقة۔۔۔أمر القاضی أن يطلقها طلقة بائنة، فإن أبى فرق بينهما، والفرقة تطليقة بائنة۔ (الهندية، باب فی العنين، ج:۱، ص:۵۲۲، ط:رشيدية)

[۳] ومتىٰ وصفه بصفة يوصف بها الطلاق...تنبئی عن الزيادة كقوله أشد الطلاق ونحوه... والثانی بائن على أصولهم (الفتاوى الهندية، كتاب الطلاق، الباب الثانی، الفصل الثالث، ج:۱، ص:۳۷۲، ط:رشيديه)

[۴] ومتىٰ وصفه بصفة يوصف بها الطلاق...تنبئی عن الزيادة كقوله أشد الطلاق ونحوه... والثانی بائن على أصولهم (الفتاوى الهندية، كتاب الطلاق، الباب الثانی، الفصل الثالث، ج:۱، ص:۳۷۲، ط:رشيديه)

لحوق اور عدمِ لحوق کا قاعدہ

آٹھواں فائدہ

لحوق اور عدمِ لحوق کا قاعدہ

طلاق یا تو صریح ہوگی یا کنایہ، دونوں صورتوں میں اس سے رجعی واقع ہوگی یا بائن، اس طرح طلاق کی چار قسمیں بنتی ہیں:

۱:......صریح رجعی جیسے: ''تجھے طلاق ہے''۔

۲:......صریح بائن جیسے: ''تجھے پہاڑ برابر طلاق''۔

۳:......کنایہ رجعی جیسے: ''تو عدت گزار''۔

۴:......کنایہ بائن جیسے: ''نکل میرے گھر سے''۔

اگر شوہر عدت کے دوران اپنی زوجہ کو دوسری طلاق دیتا ہے تو دوسری طلاق واقع ہوگی یا نہیں؟ اس بارے میں قاعدہ یہ ہے کہ طلاقِ اول' مذکورہ بالا چار طلاقوں میں سے لازماً کوئی ایک ہوگی، اسی طرح طلاقِ ثانی بھی ان چاروں میں سے کوئی ایک ہوگی، اس طرح کل سولہ صورتیں بنتی ہیں، ان سولہ صورتوں میں سے بعض میں طلاقِ ثانی واقع ہوتی ہے اور بعض میں نہیں، ذیل میں ان کا نقشہ درج کیا جاتا ہے، یہ نقشہ دو اصولوں پر

مبنی ہے، اگر ان کا استحضار رہے تو فہم میں بڑی سہولت رہے گی۔

۱:...... پہلا اصول یہ ہے کہ جس صورت میں طلاقِ اول بائن ہو، چاہے صریح بائن ہو یا کنائی بائن ہو، اور طلاقِ ثانی کنائی بائن ہو، اس صورت میں طلاقِ ثانی، طلاقِ اول کے ساتھ لاحق نہیں ہوگی، باقی تمام صورتوں میں لحوق ہوگا۔[1]

۲:...... دوسرا اصول یہ ہے کہ رجعی اور بائن جب جمع ہوتی ہیں تو دونوں بائن ہوتی ہیں، چاہے بائن پہلے ہو یا بعد میں ہو یا یوں تعبیر کرلیں کہ بائن طلاق، رجعی طلاق کو بھی بائن بنا دیتی ہے، چاہے بائن پہلے ہو یا بعد میں ہو۔[2]

---

[1] (قوله لايلحق البائن البائن) المراد بالبائن الذى لايلحق هو ما كان بلفظ الكناية لأنه هو الذى ليس ظاهراً فى إنشاء الطلاق كذا فى الفتح، وقيد بقوله الذى لايلحق إشارة إلى أن البائن الموقع أولاً أعم من كونه بلفظ الكناية، أو بلفظ الصريح المفيدة للبينونة كالطلاق على مال وحينئذ فيكون المراد بالصريح فى الجملة الثانية أعنى قولهم والبائن يلحق الصريح لاالبائن هو الصريح الرجعى فقط دون الصريح البائن" (رد المحتار، ج:۳، ص:۳۰۸، ط:سعيد)

[2] وإذا لحق الصريحُ البائنَ كان بائناً لأن البينونة السابقة عليه تمنع الرجعة كما فى الخلاصة (رد المحتار، كتاب الطلاق، باب الكنايات، مطلب الصريح يلحق الصريح والبائن، ج:۳، ص:۳۰٦، ط:سعيد)

لحوق وعدمِ لحوق کی سولہ صورتیں

نمبرشمار	طلاقِ اول	طلاقِ ثانی	مثال	حکم
۱	صریح رجعی	صریح رجعی	أنت طالق، أنت طالق	دو رجعی طلاقیں
۲	صریح رجعی	صریح بائن	أنت طالق، أنت طالق أشد الطلاق	دو بائن طلاقیں
۳	صریح رجعی	کنایہ رجعی	أنت طالق، اعتدی	دو رجعی
۴	صریح رجعی	کنایہ بائن	أنت طالق، أنت بائن	دو بائن
۵	صریح بائن	صریح رجعی	أنت طالق أشد الطلاق، أنت طالق	دو بائن
۶	صریح بائن	صریح بائن	أنت طالق أشد الطلاق، أنت طالق أشد الطلاق	دو بائن
۷	صریح بائن	کنائی رجعی	أنت طالق أشد الطلاق، اعتدی	دو بائن
۸	صریح بائن	کنائی بائن	أنت طالق أشد الطلاق، أنت بائن	ایک بائن
۹	کنائی رجعی	صریح رجعی	اعتدی، أنت طالق	دو رجعی
۱۰	کنائی رجعی	صریح بائن	اعتدی، أنت طالق أشد الطلاق	دو بائن
۱۱	کنائی رجعی	کنائی رجعی	اعتدی، اعتدی	دو رجعی
۱۲	کنائی رجعی	کنائی بائن	اعتدی، أنت بائن	دو بائن
۱۳	کنائی بائن	صریح رجعی	أنت بائن، أنت طالق	دو بائن
۱۴	کنائی بائن	صریح بائن	أنت بائن، أنت طالق أشد الطلاق	دو بائن
۱۵	کنائی بائن	کنائی رجعی	أنت بائن، اعتدی	دو بائن
۱۶	کنائی بائن	کنائی بائن	أنت بائن، أنت بائن	ایک بائن

فائدہ ۹

صریح کنایہ بائن کا لحوق وعدمِ لحوق

نواں فائدہ

صریح کنایہ بائن کالحوق وعدمِ لحوق

''صریح کنایہ بائن'' کے لحوق اور عدمِ لحوق کے متعلق ابھی گفتگو باقی ہے۔اس عنوان سے ایسی طلاق مراد ہے جو کنایہ لفظوں سے ہو اور عرف کی وجہ سے اس میں نیت کی ضرورت نہ ہو اور اس سے طلاقِ بائن واقع ہوتی ہو۔اگر شوہر ایسی طلاق کے الفاظ ایک سے زائد مرتبہ اپنی بیوی کو کہتا ہے تو کتنی طلاقیں واقع سمجھی جائیں گی؟ مثلاً: ایک شخص تین مرتبہ اپنی بیوی کو''تو مجھ پر حرام ہے،حرام ہے،حرام ہے'' کہتا ہے،تو آیا صریح کے قاعدے کے مطابق کہ''الصریح یلحق الصریح'' تین طلاقیں واقع ہوں گی؟ یا بائن کے اصول کے مطابق کہ''البائن لا یلحق البائن'' ایک ہی طلاق شمار ہوگی؟ یہ مسئلہ کچھ اختلافی ہے اور اُردو فتاویٰ بھی اس بارے میں مختلف ہیں،اس لیے کسی قدر تفصیل سے اُسے بیان کیا جاتا ہے۔

اُردو فتاویٰ پر ایک ـــ نظر

''فتاویٰ دارالعلوم دیوبند'' میں لفظِ ''آزاد'' کے متعلق لکھا ہے:

''اگر شوہر نے صریح لفظِ طلاق تین مرتبہ نہیں کہا، بلکہ آزاد کا لفظ تین بار کہا ہے تو اس سے ایک طلاق بائنہ ہوتی ہے۔''[۱]

لفظِ حرام کے متعلق بھی یہی لکھا ہے:

''حرام، حرام، حرام'' یہ طلاقِ بائن ہے، مغلظہ نہیں۔''[۲]

ایک جگہ لفظِ حرام سے وقوعِ طلاق کو نیت پر موقوف لکھا ہے:

''اگر شوہر نے یہ لفظ کہ ''تو مجھ پر حرام ہے'' بہ نیتِ طلاق کہا ہے تو طلاق بائنہ اس کی عورت پر واقع ہوگئی، عدت کے بعد نکاح ہوسکتا ہے۔''[۳]

انصاف کی بات یہ ہے کہ تینوں حوالے غیر متعلقہ ہیں اور ان سے لحوق یا عدمِ لحوق پر استدلال درست نہیں، کیوں کہ پہلے اور دوسرے حوالے میں یہ واضح نہیں کہ صاحبِ فتویٰ کے نزدیک آزاد اور حرام کا لفظ صریح ہے یا نہیں۔ تیسرے حوالے میں حرام سے وقوع کو نیت پر موقوف رکھا گیا ہے، جس سے بالکل واضح ہے کہ حرام کا لفظ

---

[۱] ج: ۹، ص: ۲۶۱، ط: دارالاشاعت

[۲] ج: ۹، ص: ۲۶۶، ط: دارالاشاعت

[۳] ج: ۹، ص: ۲۵۳، ط: دارالاشاعت

مصنفؒ کے نزدیک صریح نہیں، جبکہ ہماری گفتگو صریح کنایہ الفاظ کے بارے میں ہے۔

امداد المفتین میں عدمِ لحوق کا ذکر ہے، لفظِ حرام کے متعلق لکھا ہے:

''اگر واقع میں زید نے الفاظِ مذکورہ (تم میرے لیے بالکل حرام ہوچکیں، تین دفعہ کہا) کہے ہیں تو ایک طلاق بائنہ واقع ہوگئی۔''[1]

''فتاویٰ مفتی محمودؒ'' میں اس مضمون کے کئی فتاوی ہیں، جن میں عدمِ لحوق کا ذکر ہے، چند ایک ملاحظہ کیجیے:

''صورت مسئولہ میں اس شخص کی بیوی پر تین طلاقِ بائنہ واقع ہوگئی، خواہ نیت طلاق کی ہو یا نہ ہو اور جب پہلی دفعہ حرام کہنے سے طلاق بائنہ واقع ہوگئی تو پھر دوسری مرتبہ جو ان لفظوں کا استعمال کیا ان سے دوسری طلاقیں واقع نہیں ہوئیں''۔[2]

''تین بار کہا کہ تن تو حرام، تن تو حرام، تن تو حرام، تو ایک طلاق بائنہ ہے، بقیہ لغو ہوں گی۔''[3]

''جا! تو میری بہن ہے، آج سے مجھ پر حرام ہے'' یہ الفاظ پانچ چھ بار کہے تو ایک طلاق بائن واقع ہوگئی ہے''۔[4]

''دو بار کہا کہ ''اپنی اہلیہ کو حرام سمجھتا ہوں، میرے لیے حرام ہے'' تو ایک طلاق بائن واقع ہوتی ہے، اگر چہ ان الفاظ کو مکرر بھی کہہ دے''۔[5]

---

[1] ص:۶۲۶، ط: دارالاشاعت

[2] ج:۶،ص:۳۳۹، ط: جمعیۃ پبلی کیشنز لاہور

[3] ج:۶،ص:۳۳۹، ط: جمعیۃ پبلی کیشنز لاہور

[4] ج:۶،ص:۳۵۳، ط: جمعیۃ پبلی کیشنز لاہور

[5] ج:۶،ص:۳۵۸، ط: جمعیۃ پبلی کیشنز لاہور

مذکورہ بالا فتاویٰ میں بھی اگرچہ عدمِ لحوق کا ذکر ہے، تاہم یہ واضح نہیں کہ حرام وغیرہ کے الفاظ حضرت مفتی محمودؒ کے نزدیک صریح ہیں یا نہیں۔ یہی حال کفایت المفتی کا ہے کہ متعلقہ باب کے مطالعہ سے یہ واضح نہیں ہوسکا کہ حضرت مفتی صاحبؒ لفظِ حرام کو کنایہ ہونے کے ساتھ صریح سمجھتے ہیں یا نہیں؟

''صرف لفظِ حرام کہنے پر اس کی بیوی پر ایک طلاق بائن پڑے گی، اگرچہ لفظِ ''حرام'' تین بار کہا ہو''۔[۱]

''فتاویٰ محمودیہ'' کے حوالے بڑے واضح ہیں، ان میں لفظِ حرام کے صریح ہونے اور اس کے عدمِ لحوق کا دونوں کا وضاحت کے ساتھ ذکر ہے، ملاحظہ کیجیے:

''جواب: ''مجھ پر حرام ہے'' یہ لفظ اگرچہ اپنے لفظ کے اعتبار سے کنایہ ہے، مگر دلالتِ عرف کی بنا پر اس سے بلانیت طلاقِ بائنہ واقع ہوجاتی ہے، لیکن بائنہ کے بعد بائنہ واقع نہیں ہوا کرتی، پس دوسرے لفظ سے وقوعِ طلاق کی تقدیر پر اس سے طلاق واقع نہ ہوگی۔''[۲]

''أنتِ علی حرام'' سے بلانیت مفتیٰ بہ قول کے مطابق طلاق واقع ہوجاتی ہے۔''[۳]

''فلانة علی حرام''إن قال هذه الکلمات ثلاثَ مرات بانت بالأولی ولم تقع الثانیة والثالثة لأن البائن لایلحق البائن، کما صرح فی ردالمحتار''۔[۴]

---

[۱] ج:۶،ص:۳۸۷: دارالاشاعت

[۲] ج:۱۲،ص:۵۱۶، ط: دارالافتاء جامعہ فاروقیہ کراچی

[۳] ج:۱۲،ص:۵۲۵، دارالافتاء جامعہ فاروقیہ کراچی

[۴] ج:۱۲،ص:۵۲۵، ط: دارالافتاء جامعہ فاروقیہ کراچی

''عزیز الفتاویٰ، جلد:۱، صفحہ:۴۹۱، ط: دار الاشاعت کراچی'' میں اور ''فتاویٰ رحیمیہ'' میں لفظِ ''آزاد'' اور ''چھوڑنے'' کے متعلق فتاویٰ ہیں، مگر اُنہیں رجعی قرار دیا گیا ہے، جب کہ ہماری گفتگو بائن طلاق کے متعلق ہے، اس لیے ان دو فتاویٰ جات سے اپنے موقف کی حمایت یا مخالفت میں کوئی دلیل نہیں پکڑی جاسکتی۔

''فتاویٰ حقانیہ'' میں لفظِ حرام کو کنائی بائن اور صریح کنائی بائن دونوں طرح لکھا ہے:

''......علامہ شامیؒ نے ''بحث طلاق کنائی'' میں تصریح کی ہے کہ لفظ حرام عرفاً چونکہ طلاق ہی کے لیے استعمال کیا جاتا ہے، اس لیے مفتیٰ بہ قول یہ ہے کہ اس سے عورت پر ایک طلاق بائن واقع ہوگی، اگرچہ اس میں نیت نہ بھی کی گئی ہو، اور دوسرا، تیسرا لفظِ ''حرام'' لغو ہے۔'' [1]

اس اقتباس سے معلوم ہوا کہ لفظ حرام صریح تو ہے مگر متعدد بار اس کے استعمال سے بھی ایک ہی طلاق واقع ہوگی۔

ایک دوسری جگہ لفظِ حرام کا حکم عام کنایہ الفاظ کی طرح مذکور ہے:

''منکوحہ کو یہ کہنا کہ تو مجھ پر حرام ہے، ''طلاقِ کنائی'' ہے، جس سے طلاق کا وقوع نیت پر موقوف ہے، اس لیے خاوند نے تین طلاق کی نیت کی ہوتو تین طلاق واقع ہوں گی اور اگر تین کی نیت نہ ہو صرف یہ ارادہ ہو کہ اس سے بیوی کو ایک طلاق دیتا ہوں تو پھر طلاقِ بائن واقع ہوگی، اور اگر متعدد بار یہ الفاظ استعمال کیے جائیں اور اس سے طلاق کی نیت ہوتو ایک طلاق بائن واقع ہوکر باقی لغو ہوں گی۔ [2]

---

[1] ج: ۴، ص: ۴۰۷، ط: جامعہ دار العلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک

[2] ج: ۴، ص: ۴۷۸-۴۷۹، ط: جامعہ دار العلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک

''امداد الفتاویٰ'' میں طلاق کی تمام صورتوں کو حصرِ عقلی کے طور پر بیان کرنے کے بعد، لحوق وعدمِ لحوق کا درج ذیل قاعدہ بیان کیا گیا ہے:

''جس صورت میں طلاقِ مقدم بائن ہو، صریح یا کنایہ اور طلاق موخر کنایہ بائن ہو، اس صورت میں تو طلاق مؤخر کا وقوع نہ ہوگا، اگرچہ نیت بھی وقوع کی کرے باستثنائے مستثنیات مذکورہ فی الفقہ۔ [۱]

مذکورہ بالا کلام میں دو تین اشارے ایسے ہیں، جن سے صریح کنائی بائن کا صریح کنائی بائن سے لحوق معلوم ہوتا ہے، مثلاً:

۱:...... طلاق مؤخر کنایہ بائن ہو، اس کا استثناء کیا گیا ہے کہ وہ واقع نہیں ہوگی، صریح کنایہ بائن کو مستثنیٰ نہیں کیا گیا ہے، جس کا مطلب ہے کہ وہ لاحق ہوگی۔

۲:...... مسئلے پر جو عنوان باندھا گیا ہے، وہ اس طرح ہے:

''تحقیق عدمِ لحاق کنایہ بائن بابائن صریح ولحاق بقیۃ ببقیۃ''۔

اس عنوان کے برعکس مفہوم سے صریح کنایہ بائن کا صریح کنایہ بائن سے لحوق ثابت ہوتا ہے۔

''فتاویٰ عثمانی'' میں اس مسئلے پر تفصیلی اور مدلل گفتگو کی گئی ہے اور علامہ شامیؒ کی تحقیق کو بنیاد بنا کر عدمِ لحوق کا فتویٰ دیا گیا ہے۔ [۲] علامہ شامیؒ نے اس مقام پر بڑی محققانہ اور جاندار بحث کی ہے اور سچ یہ ہے کہ تحقیق کا حق ادا کر دیا ہے۔ جن عبارتوں سے اہلِ علم کو غلط فہمی ہوسکتی ہے، ان عبارات کی مراد کو دلائل سے واضح کیا ہے، ہر عبارت کا محمل متعین کیا

---

[۱] امداد الفتاویٰ جدید، ج:۲،ص:۴۲۷، ط: مکتبہ دار العلوم کراچی

[۲] فتاویٰ عثمانی، ج:۲،ص:۳۷۶، ط: مکتبہ معارف القرآن کراچی

میں کثرت سے شواہد اور نظائر پیش کیے ہیں، مثلاً:

لحوق اور عدمِ لحوق کی بحث میں کلیدی دلیل اور بحث کی بنیاد متون کی یہ عبارت ''البائن یلحق الصریح'' ہوتی ہے، اب اگر ''الصریح'' کے لفظ کو اپنے اطلاق پر باقی رکھا جائے تو صریح رجعی اور صریح بائن دونوں اس کے اطلاق میں داخل ہیں اور مطلب یہ ہوگا کہ بائن طلاق صریح بائن کو بھی لاحق ہوتی ہے۔ علامہ شامیؒ نے دلائل سے ثابت کیا ہے کہ ''البائن یلحق الصریح'' میں صریح سے مراد صریح رجعی ہے، صریح بائن نہیں ہے، اور جب ایسا ہے تو بائن طلاق، صریح بائن کے ساتھ لاحق نہیں ہوگی۔

"...المراد بالصریح فی الجملة الثانیة أعنی قولهم: والبائن یلحق الصریح لاالبائن، هو الصریح الرجعی فقط دون الصریح البائن، ولا یرد: أنت علی حرام علی المفتی به من عدم توقفه علی النیة مع أنه لایلحق البائن ولایلحقه البائن لکونه بائنًا، لما أن عدم توقفه علی النیة أمر عرض له بحسب اصل وضعه۔"[1]

''شیخ مخدوم ہاشم ٹھٹھوی'' نے اپنے رسالہ ''شدالنطاق فیما یلحق من الطلاق'' میں اس اشکال کا جواب اس طرح دیا ہے کہ لفظِ حرام اور اس جیسے اور کنائی الفاظ جن سے طلاق بائن واقع ہوتی ہے، ان پر سرے سے صریح کی تعریف ہی صادق نہیں آتی ہے، کیوں کہ صریح وہ ہوتا ہے جو نہ نیت کا محتاج ہو اور نہ نیت کے قائم مقام عرف اور کثرت استعمال کا محتاج ہو، جب کہ یہ الفاظ نیت کے محتاج ہیں، تاہم ان میں عرف کو نیت کے قائم مقام قرار دیا گیا ہے۔ شیخ مخدوم ہاشم اپنے موٴقف کی تائید میں ''البحر الرائق'' کے حوالے سے امام ظہیر الدین سے منقول یہ عبارت بھی لائے ہیں

---

[1] ردالمحتار، کتاب الطلاق، باب الکنایات، مطلب الصریح یلحق الصریح والبائن، ج:۳، ص:۳۰۸-۳۰۶، ط:سعید

کہ ''أنت علی حرام'' میں ہم یہ نہیں کہتے کہ نیت شرط نہیں، بلکہ ہم عرف کی وجہ سے کہنے والے کونیت کرنے والا قرار دیتے ہیں:

''إن قیل:قدفسرتم للصریح بمالایحتاج إلی النیۃ، سواء کان الواقع بہ رجعیًا أوبائنًا فیرد علیہ الکنایات الکثیرۃ الاستعمال المفیدۃ للبینونۃ نحو: ''أنت علی حرام'' لصدق حد الصریح علیھا، فینبغی أنہ إذاتلفظ بھامرۃً ثم فی العدۃ ثانیًاأن یلحق الثانی لعدم احتیاجہ إلی النیۃ مع أن المصرح بہ عدم اللحوق فیھا۔ قلنا:الکنایۃ الکثیرۃ الاستعمال لابد فیھا من النیۃ علی ظاھر الروایۃ، وإنما أفتی المتاخرون بعدم الاحتیاج إلی النیۃ فیھا، لا لأنھا لاتحتاج فی نفسھا إلیھا، بل لأنھم أقاموا کثرۃ العرف والاستعمال مقام النیۃ، ولھذا قال فی البحر الرائق:إنہ ذکر الإمام ظھیرالدین فی نحو أنت علی حرام، إنا لانقول لاتشرط النیۃ بل نجعلہ ناویًاعرفًاانتھی۔ فلایصدق حدالصریح علیھا، إذالصریح مالایحتاج إلی النیۃ ولاإلی مایقوم مقامھا من دلالۃ الحال أوکثرۃ الاستعمال''۔[1]

---

[1] صفحہ: ۵ مطبع المصطفائی (محمد مصطفی خان) ۱۳۰۰ھ

صریح کے بعد کنایہ کا استعمال

دسواں فائدہ

صریح کے بعد کنایہ کا استعمال

صریح طلاق کے ساتھ اگر شوہر کنایہ الفاظ بھی استعمال کرے تو اس کا کیا حکم ہے؟ مثلاً: یوں کہے: ’’تجھے طلاق ہے ، جہاں چاہو نکاح کرلو‘‘۔اس مسئلے کی چند صورتیں ہیں:

۱:...... کنایہ الفاظ سے شوہر کی نیت ایک الگ اور مستقل طلاق دینے کی ہو۔اس صورت میں دو بائن طلاقیں واقع ہوں گی ، دو طلاقوں کا ہونا تو واضح ہے اور دونوں بائن اس لیے ہیں کہ بائن نے رجعی کو بھی بائن بنا دیا ہے۔

۲:...... کنایہ الفاظ شوہر نے اپنی نیت اور منشا کی وضاحت کے لیے استعمال کیے ہوں۔اس صورت میں ایک طلاق بائن واقع ہوگی، کیونکہ شوہر نے خود ہی بیان دے دیا ہے اور اپنے منشا کی خود ہی وضاحت کر دی ہے کہ صریح سے اس کی مراد ایسی طلاق ہے جس سے بیوی نکاح سے نکل جائے۔

۳:......شوہر کی کچھ نیت نہ ہو۔اس صورت میں ایک رائے یہ ہے کہ دو طلاقِ بائن واقع ہوں گی، جس کی وجہ یہ ہے کہ صریح کے استعمال سے مذاکرۂ طلاق کی صورت پیدا ہوگئی، اس لیے کنایہ میں بھی نیت کی ضرورت نہ رہی اور اس سے بھی بلا نیت طلاق واقع ہوگئی۔ایک دوسرا موقف یہ ہے کہ کنایہ الفاظ لغو اور بے کار جائیں گے اور صرف ایک طلاق رجعی واقع ہوگی۔

ہمارے معاشرے میں جب لوگ اس طرح کا جملہ استعمال کرتے ہیں تو مقصد ایک نئی طلاق دینا نہیں ہوتا، کیونکہ بہت سارے لوگوں کو تو کنایہ سے طلاق کے وقوع کا علم ہی نہیں ہوتا اور جو لوگ شعور اور واقفیت رکھتے ہیں، وہ بھی بس چند معروف اور گنے چنے کنایہ الفاظ کو طلاق کے الفاظ سمجھتے ہیں، جیسے: حرام اور آزاد وغیرہ۔اس بنا پر راجح یہی معلوم ہوتا ہے کہ شوہر نے بہ طور تفسیر اور وضاحت کے ایسے الفاظ استعمال کیے ہیں۔[1]

---

[1] وفی الفتاوی لو قال لامرأته أنت طالق ثم قال للناس زن بر من حرام ست وعنی به الأول أو لا نية له فقد جعل الرجعی بائنا وإن عنی به الابتداء فهی طالق آخر بائن۔(خلاصۃ الفتاوی، ج:۲،ص:۸٦) ملاحظہ کیجیے: فقہ اسلامی، ڈاکٹر مفتی عبد الواحد، طبع: مجلس نشریات اسلام۔

فائدہ ۱۱

تاکید کا بیان

گیارہواں فائدہ

تاکید کا بیان

کلام میں زور پیدا کرنے اور جان ڈالنے کے لیے تاکید استعمال کی جاتی ہے، جس سے کلام پُرزور اور جان دار ہو جاتا ہے۔ ہر زبان میں اس کے طریقے اور الفاظ مختلف ہوتے ہیں۔ اردو زبان میں ''ضرور بالضرور، سب کے سب، اصلاً، مطلقاً، سرتاپا، خود بخود، آپ ہی آپ'' وغیرہ الفاظ تاکید کے لیے آتے ہیں۔ ضمیر کی تاکید مقصود ہو تو ''آپ'' اور ''خود'' کے الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں۔

تاکید کی ایک دوسری قسم بھی ہے، جو لفظ یا جملے کو بار بار دہرانے سے حاصل ہوتی ہے۔ ہمارا مقصود یہی دوسری قسم ہے، جو لفظ یا جملے کے تکرار سے آتی ہے۔ اس قسم کی تاکید کی مثالیں درج ذیل ہیں:

تکرارِ لفظ کی مثال:

جیسے: ''چور چور، سانپ سانپ، دیکھو دیکھو، چپکے چپکے، آہستہ آہستہ۔''

تکرارِ جملہ کی مثال:

برائی میں ہماری وہ اگر اپنا بھلا سمجھے
برا سمجھے برا سمجھے برا سمجھے برا سمجھے

تاکید کی یہ قسم چند احکامات رکھتی ہے:

۱:......لفظ یا جملے میں تاکید اور تاسیس دونوں کا احتمال ہو اور کسی ایک احتمال کو دوسرے پر ترجیح حاصل نہ ہو تو اُسے تاسیس پر حمل کیا جائے گا۔

اصولیین لکھتے ہیں:

"التأسيس خير من التأكيد"[1]

ترجمہ: "تاسیس بہ نسبت تاکید کے بہتر ہے۔"

مقصد یہ ہے کہ کلام سے نیا مطلب لینا پہلے مطلب کے مقابلے میں زیادہ بہتر ہے، چنانچہ فقہا کہتے ہیں کہ اگر لفظ میں تاسیس اور تاکید دونوں کا احتمال ہو تو اُسے تاسیس پر حمل کرنا زیادہ اچھا ہے، اسی بنا پر اگر ایک شخص نے بیوی سے کہا "أنت طالق طالق طالق" تو تین طلاقیں واقع ہوں گی۔[2]

۱:......اس قسم کے الفاظ یا جملوں میں اگر شوہر اقرار کرتا ہے کہ اس نے تکرار سے اتنی ہی طلاقیں مراد لی ہیں جتنی مرتبہ اس نے طلاق کا لفظ دہرایا ہے تو اس کے اقرار کے مطابق طلاقیں واقع ہوں گی۔

---

[1] الأشباه والنظائر، الفن الثاني، تحت القاعدة: إعمال الكلام أولى من إهماله، ص:۱۴۷، ط:قديمي

[2] "التاسيس خير من التاكيد" فإذا دار اللفظ بينهما تعين الحمل على التأسيس فلذا قال أصحابنا: لو قال لزوجته أنت طالق طالق طالق ثلاثا، فإن قال أردت بها التاكيد صدق ديانة لا قضاء، ذكره الزيلعي في الكنايات۔ (الأشباه والنظائر، ۱۴۷، ط:المكتبة الحبيبية كوئٹه۔ العقود الدرية في تنقيح الفتاوى الحامدية، ج:۱، ص:۳۷، ط:المكتبة الحقانية، پشاور)

۲:......اگر خاوند کہے کہ اس نے ایک طلاق کی نیت کی تھی اور محض کلام کو پُرزور بنانے کے لیے بار بار لفظ طلاق دہرایا ہے تو چونکہ کلام میں اس کا احتمال ہے اور ایک سے زائد احتمالات ہونے کی صورت میں شریعت متکلم کی نیت کا اعتبار کرتی ہے، جیسا کہ کنایات میں ہوتا ہے، اس لیے شوہر کا قول معتبر ہوگا اور دیانۃً ایک ہی طلاق واقع ہوگی، مگر ظاہر کا اعتبار کرتے ہوئے قاضی اس کی تصدیق نہیں کرے گا۔[1]

۳:......شوہر کچھ نیت نہیں بیان کرتا ہے اور عرف سے بھی کسی ایک معنی کی تعیین نہیں ہوتی ہے تو تکرار کو تاسیس پر حمل کیا جائے گا، کیوں کہ اصل عدمِ تاکید ہے۔

۴:......اگر شوہر کی کچھ نیت نہ تھی اور عرف میں ایسے موقع پر تاکیداً الفاظ دہرانے کا رواج ہے تو عرف کی رعایت سے ایک طلاق کے وقوع کا فتویٰ دیا جائے گا، کیوں کہ کلام کا مفہوم متعین کرتے وقت عرف کی رعایت ضروری ہے۔ اس صورت میں مذکورہ قاعدے کی مخالفت بھی نہیں ہے، کیوں کہ وہ تاسیس کو بہتر قرار دیتا ہے، ضروری نہیں۔ علاوہ ازیں عام حالات میں حکم وہی ہے جو اس قاعدے میں بیان ہوا ہے، مگر جب تاسیس کے خلاف کوئی منفی قرینہ قائم ہو اور تاکید کی تائید کرتا ہو تو کلام کو تاکید پر ہی حمل کیا جائے گا۔

۵:......اگر عرف میں لفظ کے تکرار سے تاکید مقصود نہ ہو، بلکہ مستقل طلاق دینا معروف و مروج ہو تو ہر لفظ کو نئی طلاق پر حمل کیا جائے گا۔[2]

---

[1] "رجل قال لامرأته: أنت طالق، أنت طالق، أنت طالق، فقال عنيت بالأولى الطلاق، وبالثانية والثالثة إفهامها، صدق ديانة وفي القضاء طلقت ثلاثا"۔ (الفتاویٰ الهندية، كتاب الطلاق، الفصل الاول في الطلاق الصريح، ۱/۳۵۵، ط: رشيدية)

[2] كرر لفظ الطلاق وقع الكل وإن نوىٰ التاكيد دين، أي ووقع الكل في القضاء، و كذا إذا طلق اشباه: أي بأن لم ينو استئنافا ولا تأكيدا لأن الأصل عدم التأكيد (الدر المختار مع رد المحتار، كتاب الطلاق، قبيل الكنايات، ۳/۲۹۳، ط: سعيد)

قرینہ کا بیان

بارہواں فائدہ

قرینہ کا بیان

شوہر اپنی زوجہ سے کہتا ہے:

''تجھے طلاق ہے، تجھ سے کوئی تعلق نہیں''۔

دو بائن طلاقیں واقع ہوگئیں، دو تو اس لیے کہ پہلا جملہ صریح ہونے کی بنا پر نیت کا محتاج نہیں، اس لیے اسے طلاق واقع ہونے میں کلام نہیں اور اسی جملے سے مذاکرۂ طلاق بھی ثابت ہوگیا[1] جس سے دوسرا جملہ بھی طلاق کا ہوگیا اور اس میں نیت دریافت کرنے کی ضرورت بھی نہ رہی، کیوں کہ حالتِ مذاکرہ میں صرف اس جملے میں نیت دیکھتے ہیں جو انکار کا معنی رکھتا ہو، ''تجھ سے کوئی تعلق نہیں'' میں یہ معنی نہیں پایا جاتا۔ دونوں طلاقیں بائن اس لیے ہیں کہ رجعی اور بائن جب جمع ہوتی ہیں تو وہ بائن ہوتی ہیں یا یوں

[1] فتفسر المذاکرۃ بسؤال الطلاق أو تقدیم الإیقاع۔(ردالمحتار، کتاب الطلاق، باب الکنایات، ج:۳، ص:۲۹۷، ط:سعید)

کہیے کہ بائن، رجعی کو بھی بائن بنا دیتی ہے، چاہے بائن پہلے ہو یا بعد میں۔ [۱]

اب ذرا ان جملوں کی ترتیب پلٹ دیں:

''تجھ سے کوئی تعلق نہیں، تجھے طلاق ہے''۔

دوسرے جملے سے ایک طلاق رجعی ہوگی، جب کہ پہلے جملے سے طلاق کا وقوع شوہر کی نیت پر موقوف ہے۔ وجہ فرق یہ ہے کہ پہلی صورت میں قرینہ (تجھے طلاق ہے) مقدم ہے، جس سے واضح ہے کہ دوسرے جملے سے بھی شوہر کی مراد طلاق ہے، جب کہ دوسری صورت میں قرینہ (تجھے طلاق ہے) مؤخر ہے، اس لیے اس کا اعتبار نہیں۔ اصول یہ نکلا کہ ''کنایات میں قرینے کا مقدم ہونا ضروری ہے''۔ [۲] دوسری وجہ یہ ہے کہ ''تجھ سے کوئی تعلق نہیں'' کنایہ ہے، صریح نہیں ہے اور کنایات سے مذاکرۂ طلاق ثابت نہیں ہوتا ہے۔

اب ذرا ان دو جملوں پر غور کیجیے:

''تجھے طلاق ہے، میرے پاس سے چلی جا''۔

پہلے جملے سے ایک طلاق رجعی واقع ہوگی اور دوسرا جملہ خاوند کی نیت پر موقوف ہوگا، یہاں اگرچہ قرینہ مقدم ہے اور اس سے مذاکرۂ طلاق ثابت ہوجاتا ہے، مگر دوسرا جملہ کنایات کی وہ قسم ہے جو مذاکرۂ طلاق میں بھی نیت کا محتاج ہوتا ہے۔ فائدہ یہ معلوم ہوا کہ ''جو کنایہ بہر صورت نیت کا محتاج ہو، اس میں قرینے سے بھی شوہر کی نیت ثابت نہیں کی جاسکتی۔''

---

[۱] و إذا لحق الصريح البائن كان بائنا لأن البينونة السابقة عليه تمنع الرجعة كما فى الخلاصة۔ (ردالمحتار، كتاب الطلاق، باب الكنايات، مطلب الصريح يلحق الصريح والبائن، ۳/۳۰۶، ط: سعيد)

[۲] والقرينة لا بد أن تتقدم كما يعلم مما مر فى اعتدى ثلاثا۔ (رد المحتار على الدر المختار، ۳/۳۱۴، ط: سعيد)

افعال کا حکم

تیرہواں فائدہ

افعال کا حکم

فعل مضارع موجودہ اور آئندہ دونوں زمانوں پر دلالت کرتا ہے، کبھی مضارع خالص حال کے معنی میں ہوتا ہے اور گاہے خالص استقبال کا معنی دیتا ہے۔

فعل مستقبل سے آئندہ زمانہ مفہوم ہوتا ہے۔ اس مقصد کے لیے مضارع پر ''گا'' کا اضافہ کر دیتے ہیں جیسے ''طلاق دے دوں گا''۔ کبھی ''گا'' علامت مستقبل کو حذف بھی کرتے ہیں، جیسے: ''طلاق دی ہے، نہ دوں'' یعنی نہ دوں گا۔

فعل حال میں گزرتا ہوا زمانہ پایا جاتا ہے، جیسے ''طلاق دیتا ہوں''۔ یہ فعل کبھی مستقبل کا کام دیتا ہے، جیسے: ''خالد! حامد سے کہو ہم ابھی آتے ہیں۔'' فعل حال کو ماضی کے معنی میں بھی استعمال کرتے ہیں، جیسے: ''سیانے کہتے ہیں''، ''شیخ سعدی فرماتے ہیں''۔ فعل حال ایک اور طریقے سے بھی بناتے ہیں۔ مصدر سے علامت مصدر ''نا'' حذف کرنے کے بعد اس کے ساتھ ''رہا ہوں، رہے ہیں'' وغیرہ کا اضافہ کر دیتے ہیں،

جیسے ’’طلاق دے رہا ہوں‘‘ ائمہ فن نے اسے حال استمراری یا حال ناتمام لکھا ہے۔ استمراری کا مطلب جس میں فعل کی تکرار سمجھی جائے، اور جس سے فعل کا پورا ہونا نہ سمجھا جائے اُسے حال ناتمام کہتے ہیں۔

فعلِ مستقبل سے طلاق نہیں ہوتی، بلکہ اسے وعدہ یا دھمکی سمجھا جاتا ہے، جیسے: ’’طلاق دوں گا یا دے دوں گا‘‘، جب شوہر اپنی دھمکی پر عمل کرتے ہوئے طلاق دے دے گا تو واقع ہو جائے گی۔

فعلِ حال سے طلاق ہو جاتی ہے، مگر شرط یہ ہے کہ مستقبل کے معنی میں نہ ہو، جیسے: ’’طلاق دیتا ہوں۔‘‘ کبھی محاورے کے الفاظ زمانہ حال کے ہوتے ہیں، مگر مراد مستقبل ہوتا ہے اور کبھی کوئی لفظی یا معنوی قرینہ ایسا قائم ہوتا ہے جو مستقبل پر دلالت کرتا ہے، جیسے: ’’بس آرہا ہوں‘‘ حال کا صیغہ ہے، مگر مستقبل کے معنی میں ہے یا کسی سے کہو کہ ’’آؤ‘‘ تو جواب میں کہتا ہے کہ ’’آرہا ہوں، آرہا ہوں‘‘ حالانکہ آنے کی تیاری یا اس کی یقین دہانی کراتا ہے۔ پہلی مثال میں لفظِ ’’بس‘‘ اور متکلم کی حالت اور دوسری مثال میں ’’تکرارِ جملہ‘‘ لفظی قرینہ ہے، جو حال کو مستقبل کے معنی میں کر رہا ہے۔

مضارع میں حال اور استقبال دونوں زمانے پائے جاتے ہیں، اس لیے طلاق کے وقوع کے لیے شرط یہ ہے کہ اس کا غالب استعمال زمانۂ حال میں ہوتا ہو:

”صیغة المضارع لا یقع بها الطلاق إلا إذا غلب فی الحال کما صرح به الکمال ابن الهمام عليه الرحمة“۔ [1]

ترجمہ:...... ’’مضارع کے صیغے سے طلاق واقع نہیں ہوتی، مگر یہ کہ اس کا

---

[1] تنقیح الفتاوی الحامدیة، ج:۱، ص:۳۸، ط: رشیدیة

غالب استعمال زمانہ حال میں ہو، جیسا کہ شیخ کمال ابن ہمامؒ نے اس کی صراحت کی ہے۔''

"لأن المضارع حقیقة فی الحال مجاز فی الاستقبال"۔[1]

ترجمہ:......''مضارع زمانہ حال میں حقیقت ہے اور مستقبل میں مجاز ہے۔''

"و أنا أطلق نفسی لم یقع لأنه وعد"۔[2]

ترجمہ:......''میں اپنے آپ کو طلاق دیتی ہوں'' کہنے سے طلاق نہیں ہوئی، کیوں کہ یہ وعدہ ہے۔''

اس تفصیل سے دو باتوں کی طرف توجہ دلانی مقصود ہے: ایک یہ کہ افعال کے مختلف استعمالات پیش نظر رہنے چاہئیں اور دوسرے یہ کہ فعل کے ساتھ موجود لفظی اور معنوی قرائن نظر انداز نہیں کرنے چاہئیں، کیونکہ قرائن لفظ کا مفہوم کچھ سے کچھ کر دیتے ہیں۔

---

[1] ردالمحتار، کتاب الطلاق، باب تفویض الطلاق، ج:۳، ص:۳۱۹، ط:سعید

[2] الدر المختار، کتاب الطلاق، باب تفویض الطلاق، ج:۲، ص:۶۵۷، ط:سعید

"و کذا المضارع إذا غلب فی الحال مثل: أطلقک کما فی البحر"۔ (رد المحتار، کتاب الطلاق، باب الصریح، ج:۳، ص:۲۴۸، ط:سعید)

فائدہ ١٤

قضاء و دیانت

چودھواں فائدہ

قضاء ودیانت

دیانت بندے اوراس کے رب کے درمیان کا معاملہ ہے،جس کا مدار نیت پر ہے۔اس کی حقیقت قیامت کے دن آشکارا ہوگی، کسی اور کواس میں دست اندازی کا حق نہیں ہے۔مفتی کا اصل منصب دیانت ہی کا حکم بتانا ہے۔جوشخص جس طرح اپنی منشا بیان اوراپنی نیت کا اظہار کرے، مفتی اسی کے مطابق اُسے حکم بتانے کا پابند ہے، چاہے وہ اپنی نیت میں سچا ہو یا جھوٹا، اس کی نیت امر واقعہ کے مطابق ہو یا مخالف۔حقیقتِ حال کی تفتیش اورامرِ واقعہ کی تحقیق مفتی کا منصب نہیں، وہ نیت کے مطابق حکم بتا کراصل معاملے کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کردے گا۔اگر بتانے والا اپنے بیان میں سچا ہے تو اجر وثواب پائے گا اور اگر جھوٹا ہے تو مفتی کا فتویٰ اسے کوئی فائدہ نہ دے گا اوروہ خدا کے ہاں ماخوذ ہوگا۔اس کے برعکس قضاء بندے اور بندے کے درمیان کا معاملہ ہے،جس کا تعلق ظاہر کے ساتھ ہے اورقاضی ظاہر پر عمل کا مکلف ہے۔

"المفتی یفتی بالدیانۃ و القاضی یقضی بالظاھر۔"[1]

مفتی اور قاضی کا یہ فرق ہے کہ مفتی کا تقرر حاکم وقت کی طرف سے نہیں ہوتا، اس لیے وہ قوتِ نافذہ بھی نہیں رکھتا۔ اگر ریاست کی طرف سے مفتی کا تقرر ہو پھر بھی مفتی کے منصب کے لیے حاکم کی طرف سے تقرری کوئی لازمی شرط نہیں ہے۔ اس کے برخلاف قاضی کے لیے تقرر شرط ہے اور وہ اس بنا پر قوتِ حاکمہ بھی رکھتا ہے۔ بہر حال مفتی ہر وہ شخص ہے جو فتویٰ دے، جبکہ قاضی کے لیے تقرر شرط ہے۔

مفتی فرضی اور غیر واقعی سوال پر بھی فتویٰ دے سکتا ہے، جب کہ قضاء کی بنیاد حقیقی اور یقینی امور پر ہوتی ہے۔ قضاء کی تحدید و تخصیص ہوسکتی ہے۔ "القضاء یختص بزمان و مکان" فقہ کا مشہور مسئلہ ہے، مثلاً: خلیفۂ وقت خود یا اگر اُس نے اختیار وزیرِ عدل یا قاضی القضاۃ کو تفویض کیا ہے تو وہ اس مفوضہ اختیار کو استعمال میں لاتے ہوئے قاضی کو پابند کرسکتا ہے کہ وہ دیوانی یا صرف فوجداری مقدمات کی سماعت کرے یا ایک خاص مالیت سے زیادہ یا سنگین نوعیت کے مقدمات کی سماعت نہ کرے یا پھر اس کا علاقائی اختیارِ سماعت محدود کرسکتا ہے، مثلاً: یہ کہ تحصیل یا ضلع کی حدود سے باہر کے مقدمات اس کی عدالت میں درج نہیں کیے جاسکتے، وغیرہ۔ اس کے علاوہ قضاء کا دائرہ فی نفسہ بھی محدود ہے، جب کہ فتویٰ کا دائرہ مکلف کی پوری زندگی تک پھیلا ہوا ہے۔

اگر قرائن و آثار نیت کو جھٹلاتے ہیں تو قاضی انہیں نظر انداز نہیں کرسکتا، کیونکہ وہ اقرار، شہادت، اور ظاہری شواہد و قرائن کو زیر غور لانے کا پابند ہے، پھر اگر اس کا فیصلہ واقعہ کے مطابق ہے تو اس کی خلاف ورزی دنیا اور آخرت میں پکڑ کا باعث ہے اور اگر

---

[1] الفتاوی البزازیۃ، کتاب الایمان، ج:٢، ص:٧٣

حقیقت حال کے خلاف ہے تو دنیا میں بہرحال اس کی خلاف ورزی قابل مؤاخذہ ہے۔

ایک معاملہ کب تک دیانت کا معاملہ رہتا ہے اور کب قضاء کی حدود میں داخل ہوجاتا ہے؟ جب تک معاملہ قاضی کی عدالت میں پیش نہ ہو وہ دیانت کے ذیل میں آتا ہے، اگرچہ پوری دنیا اس سے باخبر ہو اور جب وہ قاضی کی عدالت میں پیش ہوجاتا ہے تو وہ قضاء کی حدود میں داخل ہوجاتا ہے، اگرچہ صاحب معاملہ اور قاضی کے علاوہ کوئی اور اس پر مطلع نہ ہو۔

قضاء اور فتویٰ دونوں کا وجود مسلم ریاست اور مسلمان معاشرے کے لیے ناگزیر ہے۔ دونوں اسلامی نظام عدل کا حصہ ہیں اور اس لحاظ سے ایک ہی جڑ کی شاخیں اور ایک ہی مقصد کے حصول کا ذریعہ ہیں، دونوں ایک دوسرے کی معاون و مددگار اور ایک دوسری کو قوت و طاقت بہم پہنچاتی ہیں۔ قضاء خالص عدالتی کارروائی ہے تو فتویٰ نیم عدالتی ہے۔ بہت حد تک دونوں کی شرائط بھی یکساں اور دائرہ بھی مشترکہ ہے، مگر اس کے باوجود یہ دونوں الگ الگ شعبے سمجھے گئے ہیں۔ نبوت کی ذات بابرکات تو تمام ہی صفات کی مالک اور ہر حیثیت کی جامع تھی۔ وحی کی ترجمانی، سلطنت کی حکمرانی، رعایا کی نگہبانی، فوجوں کی سالاری، الغرض صدہا صفات سمٹ کر ایک ہی وجود میں جمع ہوگئی تھیں۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد حضرات خلفاء راشدین ؓ میں سے بھی ہر ایک کی ذات مجموعۂ صفات اور شخصیت کئی شخصیات پر مشتمل تھی، مگر بعد میں باستثنائے ایک شخصیت کے، جامعیت اور مرکزیت کی وہ شان باقی نہ رہی، صفات بٹ کر کئی ایک میں تقسیم ہوگئیں، مناصب علیحدہ اور شعبے متفرق ہوگئے، اس وقت سے قضاء اور افتا بھی الگ ہوگئے اور اسی طرح علیحدہ چلے آرہے تھے کہ ایک وقت ایسا آیا کہ انتظامی لحاظ سے تو یہ دونوں

شعبے الگ ہی رہے، مگر علمی حیثیت سے قضاء کا شعبہ فتویٰ کے تابع ہوگیا۔ یہ وہ وقت تھا جب ایک مرتبہ پھر اس ابدی صداقت اور آفاقی اصول کا ظہور ہوا کہ علم غلبہ اور برتری ہے اور جہالت مغلوبیت اور محکومیت ہے۔ جب قاضیوں میں جہالت عام ہوگئی تو اس کی تلافی مفتی کے فتوی سے کی جانے لگی۔ مفتی حکم شرعی بتادیا کرتا تھا اور قاضی اسے نافذ کردیا کرتا تھا۔ مگر قاضی کے لیے دیانت اور قضاء کا فرق سمجھنا دشوار تھا، جس کی وجہ سے یہ امکان تھا کہ کہیں وہ اپنے منصب کے برخلاف حکمِ دیانت پر فیصلہ نہ کردے، اس لیے مفتی حضرات دیانت کا حکم صرف زبانی بتادیا کرتے تھے، اس کی تحریر نہیں دیتے تھے اور اگر تحریر دیتے تو اس میں یہ صراحت کردیتے تھے کہ قاضی اس کے مطابق فیصلہ نہ کرے۔ دونوں صورتوں میں مقصد یہی ہوا کرتا تھا کہ قاضی اپنی جہالت کے سبب حکمِ دیانت پر فیصلہ نہ کردے، اس طرح قضاء اور فتوی قریب آتے چلے گئے اور دھیرے دھیرے فتوی نے قضاء کی حیثیت اختیار کرلی اور آہستہ آہستہ مفتی نے قاضی کا منصب سنبھالنا شروع کردیا۔ اس کا ایک اثر یہ بھی ہوا کہ جب قاضی مفتی کے فتوی کے مطابق فیصلہ کرنے لگا تو مفتی نے بھی قضاء کا حکم لکھنا شروع کردیا، تاکہ قاضی اس کے مطابق فیصلہ کرے۔ اس طرح قضاء کے مسائل کو شہرت بھی ملی اور وہ مدون بھی ہوئے، جبکہ دیانت کے مسائل یہ درجہ حاصل نہ کرسکے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ عام کتابوں میں زیادہ تر قضاء کے مسائل درج ہیں اور دیانت کے مسائل کم مذکور ہیں۔ مفتی اگر محقق نہ ہو تو وہ اسی کے مطابق فتویٰ دے دیتا ہے، اس طرح شعوری یا غیر شعوری طور پر وہ قاضی کی عمل داری میں مداخلت کرجاتا ہے۔ یہ مداخلت کسی اہمیت کے لائق نہ ہوتی، اگر قضاء اور دیانت کے احکام ہر ہر معاملے میں ایک ہوتے، مگر جب ایسا نہیں ہے تو ہر ایک کو اپنی حدود تک محدود رہنا ہی مناسب ہے:

”لکن یکتب (المفتی) بعدہٗ و لا یصدق قضاءً لان القضاء تابع للفتوی فی زماننا لجھل القضاۃ ، فربما ظن القاضی أنہ یصدق قضاءً أیضا۔“[1]

”المراد من قولھم یدین دیانۃً لا قضاءً أنہ إذا استفتی فقیھا یجیبہ علی وفق ما نوی، ولکن القاضی یحکم علیہ بوفق کلامہ ولا یلتفت إلی نیتہ إذا کان فیما نوی تخفیف جری العرف فی زماننا أن المفتی لا یکتب للمستفتی مایدین بہ بل یجیبہ عنہ باللسان فقط، لئلایحکم لہ القاضی لغلبۃ الجھل علی قضاۃ زماننا۔“[2]

حضرت مولانا سید محمد انور شاہ کشمیریؒ نے اپنی تحریرات میں دونوں کے فرق اور خلط پر اپنی عادت کے موافق بڑی فاضلانہ بحث اور محققانہ تبصرہ کیا ہے۔ قضاء وافتاء میں دو تین طرح سے فرق ثابت کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

”محقق علما نے لکھا ہے کہ مفتی قضاء کے مسئلے میں مداخلت نہ کرے۔ عام مفتی فی زماننا اس نکتہ سے ناواقف ہیں اور وہ فتوے کے ساتھ ساتھ قضاء میں بھی مداخلت کر جاتے ہیں، حالانکہ یہ جائز نہیں ہے۔ اور میں اس کی وجہ یہ سمجھتا ہوں کہ عام فقہی کتابوں میں مسائل قضاء مذکور ہیں، دیانت کے مسائل موجود کتابوں میں مہیا نہیں، ان کا اہتمام مبسوطات میں ہے۔ عصر حاضر کے غریب مفتیوں کی وہاں تک رسائی نہیں تو وہ ان ہی مسائل کا ذکر کر دیتے ہیں جو قضاء کی فہرست میں آتے ہیں۔ اور یہ اس وجہ سے ہوا کہ سلطنت عثمانیہ میں قاضی حنفی تھا اور مفتی چاروں مذاہب کے تھے، حنفی قاضی ان کے فتوے کے مطابق فیصلہ کرتا، مفتیوں نے بھی قضاء کے مسئلے

---

[1] ردالمحتار، کتاب الحظر والاباحۃ، ج:۶، ص:۴۲۱، ط:سعید

[2] تنقیح الحامدیۃ، ج:۱، ص:۳، ط:دار المعرفۃ بیروت

لکھنا شروع کئے، تاکہ حنفی قاضی ان کی تنفیذ کرے، اس طرح قضاء کے
مسئلے شائع ذائع ہوگئے اور دیانت کے مسائل عام شہرت حاصل نہ
کر سکے، حالانکہ دیانت اور قضاء میں اتفاق ضروری نہیں، بلکہ کبھی دونوں
کے احکام بالکل ایک دوسرے سے مخالف ہوتے ہیں۔'' [1]

حضرت کشمیریؒ کا کلام اپنے مفہوم اور مدعا میں واضح ہے اور حاصل اس کا یہ ہے کہ مفتی اگر مختصرات اور متداولات کے ساتھ مبسوطات اور مفصلات پر نظر نہ رکھتا ہو، بالفاظ دیگر اگر اس کا مطالعہ محدود ہو اور نظر وسیع نہ ہو تو وہ ایک طرح کی ''مداخلت بے جا'' کا مرتکب ہو جاتا ہے۔

دیانت کے مسائل کیوں شہرت حاصل نہ کر سکے اس کی بڑی اور اہم وجہ بھی حضرتؒ نے ارشاد فرما دی ہے، اس لیے اس پر بحث کو طول دینے اور مزید تشریح اور حاشیہ آرائی کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ تاہم اس مقام پر یہ سوال ذہن میں کھلبلاتا ہے کہ جب مفتی کا منصب دیانت پر فتویٰ دینا ہے تو پھر اہل افتاء دیانت کے مطابق فتویٰ کیوں نہیں دیتے ہیں؟ یہ سوال اس عموم کے ساتھ تو مبالغہ پر مبنی اور خلاف حقیقت معلوم ہوتا ہے، تاہم کنایات کے متعلق اس میں کوئی خاص مبالغہ محسوس نہیں ہوتا، مطبوعہ فتاویٰ جات اور مختلف دارالافتاؤں سے جاری جوابات سے اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ یقیناً اہل افتاء اس کی کوئی معقول توجیہ پیش کریں گے اور وسعت مطالعہ رکھنے والے اہل علم کی نگاہ سے اس کا کوئی ٹھوس جواب بھی گزرا ہوگا اور وہی اس کا درست جواب ہوگا، تاہم جو وجہ فہم ناقص میں آتی ہے اور ممکن ہے کہ درست نہ ہو، وہ یہ ہے کہ دیانت کے مسائل پر فتویٰ نہ دینے کی بڑی وجہ خود معاشرے میں دیانت کی کمی اور قضاء شرعی کی عدم دستیابی ہے۔

---

[1] حیات محدث کشمیریؒ، تالیف، حضرت مولانا انظر شاہ مسعودیؒ، ص: ۲۴۲، ط: ادارہ تالیفات اشرفیہ، ملتان

لوگ ظاہری قرائن اور مضبوط شواہد و آثار کے برخلاف نیت بیان کرتے ہیں، بسااوقات یہ قرائن اس حد تک مضبوط اور ناقابل تردید ہوتے ہیں کہ سب مل کر ٹھوس شہادت جیسی قوت رکھتے ہیں اور انہیں ملاحظہ کرنے کے بعد دل گواہی دیتا ہے اور کھلی آنکھوں نظر آتا ہے کہ ناقابل انکار حقیقت کو جھٹلانے کی کوشش کی جارہی ہے۔ اگر دیانت اس معیار کی ہوتی جس طرح کسی زمانے میں ہوا کرتی تھی تو اسے بنیاد اور معیار بنانے میں نہ صرف یہ کہ کوئی حرج نہیں تھا، بلکہ عین حکم شرعی تھا، مگر جب دیانت کا وہ معیار نہیں رہا اور دوسری طرف قضاء شرعی بھی موجود نہیں ہے تو ایسے حالات میں مصلحتِ شرعی مفتی کو مداخلت پر مجبور کرتی ہے۔ اگر غور کیا جائے تو شریعت میں اس کے نظائر بھی موجود ہیں، مثلاً: دورِ نبوت میں اگر کوئی شخص اپنی زوجہ کو ایک ہی مجلس میں تین مرتبہ طلاق کے الفاظ دہراتا اور اپنی نیت تاکید کی بیان کرتا تو دیانت کے برتر اور اعلیٰ معیار کے پیش نظر اس کی تصدیق کی جاتی تھی، مگر جب قلوب کا وہ حال نہ رہا تو دورِ فاروقی میں ایک مجلس کی تین طلاقیں تین ہی قرار دی گئیں اور صحابہؓ نے اس پر اتفاق کیا۔ اس فیصلے کی روح وہی زمانہ کا تغیر اور دیانت کی کمی تھی۔ جس صورت میں بیوی طلاق کا مسئلہ دریافت کرتی ہے، اس صورت میں حکم قضاء پر فتویٰ دینے کی یہ توجیہ پیش کی جاسکتی ہے کہ بیوی کی حیثیت قاضی کی ہوتی ہے، گویا وہ پوچھنا چاہتی ہے کہ بحیثیت قاضی کے میرے لیے اس مسئلے میں کیا حکم ہے؟ اس لیے اسے حکمِ قضاء بتادیا جاتا ہے۔ تحکیم میں بھی قضاء کا رنگ نمایاں ہوتا ہے، اس لیے مفتی بحیثیت فیصل اور حکم کے حکمِ قضاء پر فیصلہ کر دیتا ہے۔

بہر حال عوامل اور اسباب کچھ بھی ہوں، مفتی کا اصل منصب دیانت کا حکم بتانا ہے، اور اپنے منصب کے تقاضے کے پیش نظر وہ طلاق کے مسائل میں شوہر کی نیت پر فتویٰ دینے کا پابند ہے۔ ظاہری قرائن جسے طلاق کے باب میں دلالت حال سے تعبیر

کرتے ہیں، اس پر فیصلہ مفتی نہیں، بلکہ قاضی کا منصب ہے۔

صریح سے دیانۃً عدمِ وقوع

صریح نیت کا محتاج نہیں ہوتا ہے، لیکن اگر شوہر صریح میں طلاق کے علاوہ کسی اور معنی کا دعویٰ کرتا ہے تو اس کا دعویٰ قابلِ قبول ہے یا نامقبول ہے؟ اس کا جواب پہلے گزر چکا ہے کہ صریح کے استعمال کے وقت نیت طلاق کی ہو یا کچھ نیت نہ ہو، طلاق واقع ہوجائے گی۔ تاہم جس صورت میں شوہر طلاق کے علاوہ کچھ اور نیت بیان کرتا ہے، اس صورت میں اختلاف ہے، بعض کے نزدیک قضاءً تو طلاق واقع ہوجائے گی، کیوں کہ شوہر نے صریح کا استعمال کیا ہے، مگر دیانۃً واقع نہ ہوگی، کیوں کہ اس کی نیت طلاق کی نہیں تھی، صاحبِ بحر علامہ ابن نجیمؒ کا یہی موقف ہے۔ یہ عبارت جو ایک مسلمہ اصول کی طرح کتابوں میں منقول چلی آرہی ہے کہ صریح نیت کا محتاج نہیں ہوتا ہے، یعنی ''الصریح لا یحتاج إلی النیة'' شیخ ابن نجیمؒ فرماتے ہیں کہ اس سے مراد صرف قضاءً ہے، دیانۃً صریح بھی نیت کا محتاج ہے۔ صاحبِ بحرؒ کا استدلال ایک تو اس جزیے سے ہے کہ اگر شوہر نے ''أنت طالق'' کہا، مگر اس کی نیت نکاح کی بندش سے آزادی دینے کی نہیں، بلکہ قید سے رہائی دینے کی تھی، اسی طرح اگر وہ کچھ اور کہنا چاہتا تھا مگر سبقتِ لسانی سے اس کی زبان سے ''أنت طالق'' نکل گیا تو دونوں صورتوں میں صرف قضاءً طلاق واقع ہوگی، دیانۃً نہ ہوگی، کیوں کہ اس کی نیت طلاق کی نہ تھی۔

صاحبِ بحرؒ کا موقف نقل کرنے کے بعد علامہ شامیؒ نے اس کی تردید کی ہے۔ پہلے جزیے کا جواب یہ دیا ہے کہ شوہر نے صریح کے لفظ سے طلاق کے علاوہ ایک ایسا مطلب مراد لیا ہے جس کا لفظ میں احتمال ہے اور دوسرے جزیے میں شوہر کا مقصد ہی

بیوی کو طلاق دینے کا نہیں ہے، اس لیے دونوں جزئیات سے یہ تو ثابت ہوتا ہے کہ صریح سے دیانۃً طلاق کے وقوع کے لیے شرط ہے کہ شوہر صریح میں طلاق کے علاوہ کوئی اور معقول تاویل نہ کرتا ہو اور اس کا قصد طلاق کے لفظ سے طلاق دینے کا ہو، مگر یہ ثابت نہیں ہوتا کہ صریح میں طلاق کی نیت کرنا بھی شرط ہے۔

دونوں جزئیات کا جواب ذکر کرنے کے بعد علامہ شامیؒ نے اپنی رائے کی تائید میں دو دلیلیں پیش کی ہیں: ایک تو یہ کہ اگر شوہر نے ''أنت طالق'' کہا اور پھر کہتا ہے کہ میری نیت بیوی کو نکاح سے آزادی دینے کی نہیں، بلکہ عمل سے آزاد کرنے کی تھی تو ازروئے قضاء ودیانت دونوں طرح طلاق واقع ہوجائے گی، حالانکہ شوہر نے طلاق کے علاوہ معنی کی نیت کی تھی، اس لیے چاہیے تھا کہ طلاق واقع نہ ہوتی۔ دوسرے یہ کہ اگر شوہر نے بطور'' ہزل'' طلاق دی تو قضاءً اور دیانۃً دونوں طرح طلاق واقع ہوگی، حالانکہ ہزل (مزاح) کرنے والے کا مقصد لفظ سے اس کا مطلب نہیں ہوتا ہے۔ وہ سبب کو عمل میں لاتا ہے، مگر مسبب کا ارادہ نہیں کرتا ہے۔

فتاویٰ شامی کا متعلقہ مقام ملاحظہ کرنے کے بعد جو کچھ فہم میں آتا ہے، اس کا حاصل یہ ہے کہ صریح سے دیانۃً طلاق کا وقوع نیت پر موقوف نہیں ہے۔ جن جزئیات میں عدم وقوع کا ذکر ہے، وہاں کوئی اور شرط مفقود ہے، مثلاً:

شوہر نے لفظ کا قصد نہیں کیا ہے۔

یا شوہر صریح زبان پر لایا ہے، مگر وہ اس لفظ کا مطلب نہیں جانتا ہے۔

یا سبقت لسانی سے صریح اس کی زبان سے نکل گیا ہے۔

یا اس نے طلاق کی اضافت بیوی کی طرف نہیں کی ہے۔

یا پھر وہ صریح کے معنی میں کوئی مناسب، معقول اور قابل قبول تاویل کرتا ہے۔

اگر درج بالا صورتوں میں سے کوئی صورت ہو تو صریح سے دیانۃً بھی طلاق واقع نہ ہوگی، مگر چونکہ اس نے صریح کا استعمال کیا ہے، اس لیے قضاءً اس کی نیت کا اعتبار نہیں ہوگا۔ [1]

---

[1] "ولو قال لها: أنت طالق ثم قال: أردت أنها طالق من وثاق لم يصدق في القضاء۔ ويصدق فيما بينه وبين الله تعالٰى لأنه نوىٰ مايحتمله كلامه في الجملة۔" (بدائع الصنائع ، كتاب الطلاق، كتاب الصريح، فصل الصريح، ج:۳، ص:۱٦۱، ط:دار احياء التراث العربى)

ــــ "مطلب في قول البحر: إن الصريح يحتاج في وقوعه ديانة إلى النية (قوله أو لم ينو شيئا) لما مر أن الصريح لا يحتاج إلى النية، ولكن لابد في وقوعه قضاءً وديانةً من قصد إضافة لفظ الطلاق إليها عالما بمعناه ولم يصرفه إلى ما يحتمله كما أفاده في الفتح، وحققه في النهر، احترازاً عما لو كرر مسائل الطلاق بحضرتها ، أو كتب ناقلا من كتاب امرأتي طالق مع التلفظ، أو حكى يمين غيره فإنه لا يقع أصلا مالم يقصد زوجته، وعما لو لقنته لفظ الطلاق فتلفظ به غير عالم بمعناه فلا يقع أصلا على ما أفتى به مشايخ أوزجند صيانة عن التلبيس وغيرهم من الوقوع قضاءً فقط،وعما لو سبق لسانه من قول أنت حائض إلى أنت طالق فإنه لا يقع قضاءً فقط، عما لو نوى بانت طالق الطلاق من وثاق فإنه يقع قضاء فقط أيضا۔ وأما الهازل فيقع طلاقه قضاءً وديانةً لأنه قصد السبب عالما بأنه سبب، فرتب الشرع حكمه عليه أراده أو لم يرده كما مر، وبهذا ظهر عدم صحة مافى البحر والأشباه من أن قولهم إن الصريح لا يحتاج إلى النية إنما هو فى القضاء، أما فى الديانة فمحتاج إليها أخذا من قولهم: لو نوى الطلاق عن وثاق أو سبق لسانه إلى لفظ الطلاق يقع قضاءً فقط أي لا ديانة، لأنه لم ينوه، وفيه نظر، لأن عدم وقوعه ديانة في الأول لأنه صرف اللفظ إلى يحتمله، وفي الثانى لعدم قصد اللفظ، واللازم من هذا أنه يشترط في وقوعه ديانة قصد اللفظ عدم التاؤيل الصحيح۔ أما اشتراط نية الطلاق فلا بدليل أنه لو نوى الطلاق عن العمل لا يصدق ويقع ديانة أيضا كما يأتى مع أنه لم ينو معنى الطلاق وكذا لو طلق هازلا۔" (ردالمحتار، كتاب الطلاق، باب الصريح، مطلب في قول البحر: ان الصريح يحتاج في وقوعه ديانة الى النية، ج ۳/ ۲۵۰، ط: سعيد)

صریح سے قضاءً طلاق کا عدم وقوع

دیانت پر کلام کے بعد اب ہمارے سامنے قضاء کا مسئلہ ہے کہ کن صورتوں میں صریح سے قضاءً بھی طلاق واقع نہ ہوگی۔ اس بارے میں کوئی واضح اور متعین اصول تو معلوم نہیں، تاہم ایک اصول تشکیل دیا جاسکتا ہے کہ جن صورتوں میں کسی شرط کے مفقود ہونے سے دیانۃً طلاق واقع نہ ہو، جیسا کہ پچھلے عنوان میں اس کی مثالیں گزر چکی ہیں، ان صورتوں میں اگر کوئی ایسا منفی قرینہ بھی موجود ہو جو طلاق کے عدم وقوع پر دلالت کرتا ہو تو شوہر کا قول قضاءً بھی قابلِ قبول ہوگا اور عدالت طلاق کے عدم وقوع کا حکم جاری کرے گی، مثلاً: شوہر طلاق کا لفظ استعمال کرتا ہے اور اس میں کوئی معقول اور قابل قبول تاویل کرتا ہے، مثلاً کہتا ہے کہ میری نیت اسے نکاح سے نہیں بلکہ قید سے آزاد کرنے کی تھی تو از روئے دیانت اس کی نیت معتبر ہے، کیونکہ لفظ میں اس کی گنجائش ہے۔ اب اگر یہی لفظ اس سے جبر واکراہ کے ذریعے کہلوایا گیا ہو تو قضاءً بھی طلاق واقع نہ ہوگی، کیونکہ جبر واکراہ عدم طلاق کا قرینہ ہے۔ قاضی چونکہ ظاہر پر عمل کا مکلف ہے، اس لیے جب خارجی ذریعے سے اس کی نیت کی تصدیق ہوگئی تو قاضی اس کے مطابق فیصلے کا پابند ہے۔ اس اصول کو مزید وسعت دی جاسکتی ہے، مثلاً شوہر طلاق کا تکرار کرتا ہے اور نیت تاکید کی بیان کرتا ہے تو عند اللہ اس کی نیت مقبول ہے، کیونکہ اس کا کلام تاکید کا امکان رکھتا ہے، مگر عدالت اس کی نیت کو خاطر میں نہیں لائے گی، کیونکہ اصل عدم تاکید ہے اور شوہر کا بیان ظاہر کے خلاف ہے، لیکن اگر ظاہر سے بھی شوہر کی تصدیق ہوجائے اس طرح کہ عرف میں اس لفظ کو تاکیداً دہرانے کا رواج ہو تو عدالت بھی عدم وقوع کا حکم جاری کرے گی۔ اسی طرح شوہر کا کلام صریح اضافت سے خالی ہے اور وہ طلاق کی نیت کا بھی انکار کرتا ہے تو دیانت میں طلاق واقع نہ ہوئی، اس کے ساتھ اگر کوئی قرینہ بھی ایسا نہ

ہو جس سے بیوی کو طلاق دینے کا غالب ذہن بنتا ہو تو قضاءً بھی طلاق واقع نہ ہوگی۔

حاصل کلام یہ ہے کہ صریح سے اگر کوئی اور مطلب اور معنی مراد لیا جائے اور صریح میں اس کا احتمال ہو تو دیانۃً طلاق واقع نہ ہوگی اور اگر اس کے ساتھ کوئی قرینہ بھی ایسا ہو جو غیر طلاق پر دلالت کرتا ہو تو قضاءً بھی طلاق نہ ہوگی۔ [1]

کنایہ سے وقوع و عدم وقوع

کنایہ میں حل طلب سوال یہ ہوتا ہے کہ شوہر کی نیت کیا تھی؟ اس نے کس غرض اور نیت سے کنایہ کا استعمال کیا ہے؟ اگر شوہر خود اظہار کر لیتا ہے کہ اس کا ارادہ طلاق دینے کا تھا تو اس کی نیت معتبر اور اس کا بیان قابل قبول اور اس کی بیوی پر طلاق واقع سمجھی جائے گی، کیوں کہ خود شوہر سے بڑھ کر کون اس کے قول کا شارح اور نیت کا ترجمان ہو سکتا ہے؟ لفظ اس کی نیت کا ساتھ دیتا ہے اور اس تہمت کی بھی نفی ہو جاتی ہے کہ اس نے تخفیف کی غرض سے اپنی نیت طلاق کی بیان کی ہے۔ اگر وہ طلاق کی نیت کا انکار کرتا ہے تو یہ بات بے غبار اور غیر اختلافی ہے کہ قاضی اس کی نیت کے مطابق نہیں، بلکہ دلالت حال کو مدنظر رکھ کر فیصلہ کرے گا، مگر مفتی دلالت حال کو زیر غور لانے کا پابند ہے یا نہیں؟ اصولی حیثیت سے دلالت حال پر فیصلہ مفتی کا منصب نہیں ہے۔ یہ سوال کہ

---

[1] "لو نوى به الطلاق عن وثاق دين إن لم يقرنه بعدد، ولو مكرها صدق قضاءً أيضًا (قوله صدق قضاءً) أي كما يصدق ديانة لوجود القرينة الدالة على عدم إرادة الإيقاع وهي الإكراه۔" (المرجع السابق، ج:۳، ص:۲۵۱، ط:سعيد)

— "ولو نوى به الطلاق عن وثاق دين (قوله دين) أي تصح نيته فيما بينه وبين الله تعالى لأنه نوى ما يحتمله لفظه فيفتيه المفتي بعدم الوقوع، أما القاضي فلا يصدقه، ويقضي بالوقوع لأنه خلاف الظاهر بلا قرينة۔" (رد المحتار، كتاب الطلاق، ج:۳، ص:۲۵۱، ط:سعيد)

نیت نہ ہوتو کنایہ سے عند اللہ طلاق واقع ہوگی یا نہیں؟ جواب یہ ہے کہ نیت نہ ہوتو ازروئے دیانت طلاق واقع نہ ہوگی، اگرچہ قرائن اور آثار وقوعِ طلاق پر دلالت کرتے ہوں:

"(قوله قضاء)قيد به لأنه لا يقع ديانةً بدون النية ، ولو وجدت دلالة الحال ، فوقوعه بواحد من النية أو دلالة الحال إنما هو فی القضاء فقط کماهو صريح البحر وغيره۔"[1]

الحاصل اگر نیت اور دلالت دونوں نہ ہوں تو نہ دیانۃً طلاق ہے نہ قضاءً۔

اگر دونوں ہوں یا صرف نیت ہوتو دونوں طرح طلاق واقع ہے۔ اگر نیت نہ ہو، مگر دلالت حال موجود ہوتو دیانۃً غیر واقع اور قضاءً واقع ہے۔

---

[1] ردالمحتار، باب الکنایات، ج:۳، ص:۲۹۷، ط:سعید

اضافت کا بیان

پندرہواں فائدہ

اضافت کا بیان

اضافت کا لفظ ایک اصطلاح کے طور پر مختلف علوم وفنون میں استعمال ہوتا ہے، مگر یہاں اس کا فقہی مفہوم مراد ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ شوہر طلاق دیتے وقت اس کی نسبت بیوی کی طرف کرے۔ بیوی کی طرف نسبت اس لیے ضروری ہے کہ وہ طلاق کا محل ہے اور محل نہ ہو تو طلاق نہیں ہوتی، جیسا کہ مبیع نہ ہو تو بیع نہیں ہوتی، تمام کتب اس شرط کے ضروری ہونے پر متفق ہیں اور بہت سے مسائل میں طلاق کے عدم وقوع کی وجہ اسی عدم اضافت کو قرار دیا گیا ہے۔ فقہا کہیں لکھتے ہیں کہ: ''لتركه الإضافة إليها '' اور کہیں صراحت کرتے ہیں کہ: ''لأنه ما أضاف الطلاق إليها'' طلاق کے ذکر میں فقہا نے جو تمثیلات پیش کی ہیں، وہ بھی سب کی سب اضافت پر مشتمل ہیں، جیسے: ''أنت طالق، طلقتک، طلقتها، هي طالق وغیرہ'' علامہ ابن عابدینؒ ایک اصول کے طور پر لکھتے ہیں:

> ''...لا بد في وقوعه قضاء وديانة من قصد إضافة لفظ الطلاق إليها...''[1]

---

[1] ردالمحتار علی الدر المختار، کتاب الطلاق، مطلب فی قول البحر: ان الصریح... ج:۳، ص:۲۵۰، ط:سعید

اضافت یا نیت

طلاق کے معاملے میں اضافت کے ضروری ہونے میں تو کلام نہیں، لیکن جب اضافت نہ ہو یا ہو مگر صریح نہ ہو تو پھر شوہر کی نیت دیکھی جائے گی کہ اس کا منشا بیوی کو طلاق دینے کا تھا یا نہیں؟ اگر وہ بیان کر دیتا ہے کہ اس کا مقصد اپنی زوجہ کو طلاق دینے کا تھا تو طلاق واقع سمجھی جائے گی اور یوں قرار دیا جائے گا کہ اگرچہ لفظوں میں اضافت مفقود ہے، مگر نیت میں موجود ہے:

''لا یقع فی جنس الإضافة إذا لم ینو لعدم الإضافة إلیها۔''[1]

ترجمہ:...... ''اضافت والے امور میں جب نیت نہ ہو تو بیوی کی طرف اضافت نہ ہونے پر طلاق واقع نہ ہوگی۔''

یہ حوالہ اس بارے میں صریح ہے کہ اضافت کی عدم موجودگی میں نیت ضروری ہے اور اگر نیت بھی نہ ہو تو طلاق نہ ہوگی، منطقی زبان میں یہ قضیہ مانعۃ الخلو ہے کہ اضافت یا نیت میں سے کسی ایک کا وجود کافی ہے اور اگر دونوں معدوم ہوئے تو حکم بھی معدوم ہوگا۔

اضافت یا نیت کی ضرورت کیوں؟

نیت اور اضافت میں سے کسی ایک کا ہونا اس لیے شرط ہے کہ اگر یہ دونوں نہ ہوں، یعنی نہ تو شوہر نے بیوی کی طرف اضافت کی ہو اور نہ ہی اس کی نیت اپنی بیوی کو طلاق دینے کی ہو اور محض اس بنا پر طلاق کے وقوع کا فتویٰ دیا جائے کہ اس نے طلاق

---

[1] الفتاوی الهندیة، کتاب الطلاق، الفصل السابع فی الطلاق بالالفاظ الفارسیة، ج:۱، ص:۳۸۲، ط:رشیدیه

کا لفظ ذکر کیا ہے تو پھر لازم آئے گا کہ ہر اس شخص کی بیوی کو طلاق پڑ جائے جو طلاق کا لفظ زبان پر لائے، حالانکہ ایسا نہیں ہے، قرآن وحدیث میں بار بار طلاق کا لفظ آیا ہے، دینی کتابیں اس کے ذکر سے بھری پڑی ہیں، مسلمان ان کتب کو پڑھتے ہیں، اساتذہ ان کا درس دیتے ہیں، طلبہ ان کا تکرار کرتے ہیں، اس طرح بار بار یہ لفظ زبانوں پر آتا ہے، مگر چونکہ نہ اضافت ہوتی ہے اور نہ اپنی بیوی کو طلاق دینے کی نیت ہوتی ہے، اس لیے طلاق واقع نہیں ہوتی۔

اضافت اور نیت...... احتمالی صورتیں

اضافت اور نیت جدا اور الگ الگ چیزیں ہیں اور طلاق کے وقوع کے لیے دونوں میں سے کسی ایک کا وجود شرط ہے، اس لحاظ سے دونوں کو ملایا جائے تو کل چار صورتیں بنتی ہیں، یعنی دونوں موجود ہوں، دونوں مفقود ہوں، دونوں میں سے کوئی ایک مذکور ہو۔

۱:......دونوں موجود ہوں تو وقوع طلاق میں کوئی کلام نہیں، کیوں کہ کسی ایک کا وجود بھی کافی ہے، چہ جائیکہ دونوں موجود ہوں۔

۲:......دونوں نہ ہوں تو عدم وقوع یقینی ہے، خانیہ اور خلاصہ وغیرہ میں ہے کہ:

"رجل قال لأمرته في الغضب: "اگر تو زنِ من سہ طلاق" مع حذف الياء لايقع، إذا قال: لم أنو الطلاق، لأنه لما حذف لم يكن مضيفا إليها۔"[1]

"یعنی ایک شخص نے اپنی بیوی سے کہا کہ اگر تو میری بیوی ہے تو تین طلاق" اور یوں نہ کہا کہ تجھے تین طلاق" تو طلاق واقع نہ ہوگی، جب وہ

---

[1] الفتاوى الهندية، كتاب الطلاق، الفصل السابع فى الطلاق بالالفاظ الفارسية، ج:۱، ص:۳۸۲، ط: رشيديه

یہ کہے کہ میری نیت طلاق کی نہ تھی، کیوں کہ جب اس نے ''تجھے'' کا لفظ نہ کہا تو طلاق کی اضافت بیوی کی طرف نہ کی۔''

مذکورہ بالا جزیئے میں جب شوہر نے ''تجھے'' نہ کہا تو اضافت نہ ہوئی اور جب اس نے اظہار کر دیا کہ میرا ارادہ طلاق کا نہ تھا تو نیت کی بھی نفی ہوگئی اور اور جب دونوں نہ پائے گئے تو طلاق بھی نہ ہوئی۔ اس قسم کے کئی جزئیات کتب میں مذکور ہیں، مثلاً محیط میں ہے کہ ایک شرابی نے اپنی بیوی سے کہا کہ کیا تو چاہتی ہے کہ میں تجھے طلاق دوں ؟ بیوی نے کہا ''ہاں!'' چاہتی ہوں، تو خاوند نے کہا کہ اگر تو میری بیوی ہے تو ایک طلاق، دو طلاق، تین طلاق، اٹھ اور میرے پاس سے نکل جا۔ خاوند کا بیان ہے کہ میں نے اس کہنے سے طلاق مراد نہیں لی تو اس کی بات قابل قبول ہوگی۔ اسی طرح ایک نشے والے کی بیوی بھاگ گئی، اس نے تعاقب کیا، مگر اُسے پکڑ نہ سکا تو اس نے کہا تین طلاق کے ساتھ، اب اگر وہ کہہ دے کہ میں نے اپنی بیوی کے ارادے سے کہا ہے تو طلاق ہوگی اور اگر کچھ نہ کہے تو طلاق نہ ہوگی۔

۳:...... تیسری صورت یہ ہے کہ اضافت نہ ہو مگر نیت ہو۔ اس صورت میں بھی طلاق ہوجائے گی۔ پچھلے حوالہ جات میں صرف عدم اضافت کو کافی نہیں سمجھا گیا، بلکہ اس کے ساتھ عدم نیت کو بھی ضروری ٹھہرایا گیا ہے، جس کا کھلا اور صاف مفہوم یہ ہے کہ اگر لفظوں میں اضافت نہ ہو، مگر نیت میں اضافت ہو تو طلاق واقع ہے۔ اس موضوع پر حوالہ جات آگے نیت کے بیان میں درج کیے جائیں گے۔

۴:...... چوتھی صورت یہ ہے کہ نیت نہ ہو مگر اضافت ہو۔ اس صورت کا حکم بھی واضح ہے کہ طلاق ہوجائے گی، کیوں کہ نیت یا اضافت میں سے کوئی ایک موجود ہے، مگر جب

اضافت لفظوں میں نہ ہو بلکہ معنوی ہوتو یہ صورت سب سے زیادہ الجھن پیدا کرتی ہے۔

آپ نے دیکھا کہ نظری حیثیت سے اضافت کا مسئلہ بڑا واضح، الجھن سے پاک اور اختلاف سے خالی نظر آتا ہے، مگر حقیقت میں اس مسئلے کی عملی تطبیق کافی مشکل ہے اور کہا جا سکتا ہے کہ اضافت کا مسئلہ باوجود مختصر ہونے کے فقہ کے چند الجھے ہوئے اور پیچیدہ مسائل میں سے ہے، یہی وجہ ہے کہ بلند پایہ فقہا نے اُسے الگ سے موضوع بحث بنایا ہے۔ اس پیچیدگی کا سبب جزئیات کا اختلاف اور ان کا باہم تعارض نظر آتا ہے۔ ایک اصول کی حیثیت سے یہ مسلمہ اور متفقہ قاعدہ ہے کہ وقوع طلاق کے لیے اضافت ضروری ہے، مگر کہیں بظاہر اضافت نہیں ہوتی اور طلاق واقع ہوتی ہے اور کہیں شوہر کے الفاظ میں اضافت مفقود نظر آتی ہے، مگر وقوع کا حکم لگا دیا جاتا ہے، بعض جزئیات میں مذاکرۂ طلاق کی صورت ہوتی ہے اور شوہر بیوی کے مطالبے پر اس سے مخاطب ہوکر طلاق کے الفاظ ادا کرتا ہے، یعنی اضافت معنویہ موجود ہوتی ہے، مگر حکم عدم وقوع طلاق کا ہوتا ہے اور بعض مرتبہ حکم اس کے برعکس ہوتا ہے۔ بعض مسائل میں طلاق واقع سمجھی جاتی ہے، مگر یہ کہ شوہر حلفیہ انکار کر دے اور بعض میں شوہر کا اتنی وضاحت دے دینا کافی ہوتا ہے کہ اس کا ارادہ طلاق کا نہ تھا۔

حضرت کشمیریؒ کی تحقیق

امداد المفتین میں حضرت مفتی شفیع صاحبؒ نے حضرت مولانا انور شاہ کشمیریؒ کا رسالہ شامل کیا ہے، جس کا نام ''**حكم الإنصاف فی الطلاق الغير المضاف**'' خود حضرت مفتی صاحبؒ نے تجویز کیا ہے، اس رسالے پر بشمول حضرت مفتی صاحبؒ، حضرت گنگوہیؒ، شیخ الہندؒ اور مفتی عزیز الرحمنؒ سمیت بڑے بڑے اکابر اہل فتاویٰ کے

تصدیقی دستخط ثبت ہیں۔ رسالہ ایک سوال کے جواب میں ہے اور جواب میں فقہا کی جو عبارتیں صریح اضافت نہ ہونے کی صورت میں مختلف نظر آتی ہیں، ان کے درمیان تطبیق دی گئی ہے اور خود ہی حضرت کشمیریؒ نے تمام بحث کا نچوڑ اور خلاصہ بھی بیان فرما دیا ہے، چنانچہ فرماتے ہیں:

"محصل ایں مقالہ آنکہ در تطلیق اضافت صریحہ ضرور نیست و نہ اضافت معنویہ لابدیہ است۔"

چند سطور کے بعد رقم فرماتے ہیں کہ جن عبارات میں عدم وقوع طلاق کا ذکر ہے، وہ اس صورت میں ہے کہ نہ شوہر کی نیت ہو اور نہ اس لفظ سے طلاق دینے کا عرف ہو:

"......عدم وقوع آں وقت است کہ ارادۂ طلاق زن نہ باشد، نہ عرف جاری باشد۔"[1]

حضرت تھانویؒ کی تحقیق

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے باہم متعارض ومتصادم عبارات کے درمیان جوڑ اس طرح بٹھایا ہے کہ وقوعِ طلاق کے لیے مطلق اضافت تو شرط ہے، لیکن صریح اضافت شرط نہیں ہے اور مطلق اضافت کا وجود کسی مضبوط اور قوی قرینے کے مرہون منت ہوتا ہے، اگر قرینہ ضعیف اور کمزور ہو تو وہ اضافت کی شرط پوری کرنے کے لیے کافی نہیں ہے۔ یہ سوال کہ قرینہ کب قوی ہوتا ہے؟ حضرت تھانویؒ لکھتے ہیں کہ: استقراء سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قرینہ چار قسم پر ہے:

۱:......صریح اضافت

---

[1] امداد المفتین، کتاب الطلاق، ص:۵۰۸

۲:......نیت

۳:......سوال میں اضافت

۴:......عرف

آخر میں بطور نتیجہ اور حاصل کے لکھتے ہیں کہ جن جزئیات میں عدم وقوع طلاق کا حکم ہے، اس کی وجہ یہ نہیں کہ ان میں صریح اضافت موجود نہیں، بلکہ سرے سے اضافت ہی نہیں ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

''الجواب: از قواعد و جزئیات چناں می نماید کہ شرط وقوع طلاق مطلق اضافت ست، نہ کہ اضافت صریحہ، آرے تحقق مطلق اضافت محتاج ست بقرآئن قویہ، وقرائن ضعیفہ محتملہ درآں کافی نیست۔ پس در جزئیاتیکہ حکم بعدم وقوع کردہ اند، سببش نہ آنست کہ دروا اضافت صریحہ نیست، بلکہ سبب آن ست کہ درو قرینہ قویہ بر اضافت قائم نیست۔ وآں قرینہ بہ تتبع چند قسم است۔ اول: صراحت اضافت وآں ظاہر است کما قولہ اینکت۔ دوم: نیت کما فی قولہ عینت امرأتی، واز عبارت خلاصہ ''وإن لم یقل شیئا لایقع'' شبہ نہ کردہ شود کہ نیت بلا اضافت صریحہ کافی نیست، زیرا کہ معنی لایقع أی لا یحکم بوقوعہ مالم یقل عنیت است چرا کہ کہ بدون اظہار نادی دیگراں راعلم نیت چگونہ می تواں باشد، فإذا قال: ''عنیت'' یقع، لا لقولہ عنیت، لأنہ لیس موضوعا للطلاق بل بقولہ سہ طلاق مع النیۃ فافہم، فإنہ متعین متیقن۔ سوم: اضافت در کلام سائل کما فی قولہ ''دادم'' فی جواب قولھا ''مرا طلاق دہ'' ولھذا ثلث واقع شود لتکرارھا ثلاثا، ورنہ کلام ''دادم'' نہ برائے طلاق

موضوع است ونہ برائے عدد ثلثہ۔ چہارم: عرف كما في رواية الشامي: الطلاق يلزمني ''پس در جزئیات یکہ ہمہ قرائن مفقود باشند طلاق واقع نہ خواہد شد، لا لعدم الإضافة الصريحة بل لعدم مطلق الإضافة، پس بریں تقریر در مسائل ہیچ گونہ تدافع نیست، هذا ما عندي ولعل عند غيري أحسن من هذا۔ [1]

حضرت مولانا ظفر احمد عثمانیؒ کی رائے

امداد الاحکام میں ''إزالة الإغلاق عن إضافة الطلاق'' کے نام سے اضافت کے مسئلے پر ایک مستقل رسالہ موجود ہے۔ اس رسالے میں جزئیات کا تعارض بایں الفاظ دور کیا گیا ہے:

''جن جزئیات میں اضافت صریحہ نہ ہونے کی وجہ سے عدم وقوع کا حکم مذکور ہے، ان کا مطلب یہی ہے کہ اگر زوج ارادۂ طلاق زوجہ کا انکار کرے اور قرائن بھی ارادۂ زوجہ پر قائم نہ ہوں تو طلاق واقع نہ ہوگی، لیکن اگر قرائن اضافت الی الزوجہ پر قائم ہوں تو قضاءً بہرحال واقع ہے جب کہ اضافت معنویہ خطاب یا اشارہ موجود ہی......'' [2]

اس اقتباس کا حاصل یہ ہے کہ اگر اضافت معنوی ہو اور قرینہ بھی اضافت پر قائم ہو تو قضاءً طلاق واقع ہے اور اگر قرینہ نہ ہو اور نیت بھی نہ ہو تو طلاق واقع نہیں ہے۔ مولانا ظفر احمد عثمانیؒ کی جو سوچ مذکورہ رسالے کے پس پشت ہے اور جس سے کام لے کر انہوں نے جزئیات کا تعارض حل کیا ہے، وہ قضا اور دیانت کا فرق ہے، مگر اس سوچ کے بارے

---

[1] امداد الفتاویٰ، کتاب الطلاق، ۲/ ۴۴۷، ط: دار الاشاعت

[2] امداد الاحکام، ج: ۲، ص: ۳۹۴، ط: دار العلوم کراچی

میں اپنا تذبذب بھی ظاہر کر دیا ہے، رسالے کے اختتام پر تحریر فرماتے ہیں:

''حضرت شیخ نے اس تحریر کو ملاحظہ فرما کر ارشاد فرمایا کہ: میرے نزدیک فقہا کی عبارات مطلقہ درباب عدم وقوع بسبب عدم اضافت کو دیانت پر محمول کرنا تقیید اطلاق ہے، کیونکہ **لا یقع** میں نکرہ تحت نفی ہے جو عام ہے، اس کو بلا دلیل خاص نہیں کر سکتے، ہاں! **یقع** نکرہ تحت الاثبات ہے جو عموم میں نص نہیں، اس لیے بہتر یہ ہے کہ اس کو عدمِ وجودِ قرائن پر محمول کیا جائے اور عباراتِ مفیدہ کو قرائن پر، **كما في الجواب. قلت وإليه يميل قلبي ولكن في النفس بعد شيء ولعل الله يحدث بعد ذلك أمرًا.**''[1]

[1] امداد الاحکام، کتاب الطلاق، إزالة الإغلاق عن إضافة الطلاق، ۲/۴۰۱، ط: دار العلوم کراچی

مباحث گزشتہ کا خلاصہ

گزشتہ سطور میں اکابر کی تحقیقات ہم ملاحظہ کر چکے، اگر ان تحریرات کے ساتھ دیگر اکابر اہل فتویٰ کے فتاویٰ جات بھی سامنے رکھے جائیں تو مجموعی حیثیت سے اضافت کے مسئلے کی چند صورتیں نکلتی ہیں، اضافت کے مسئلے کو صورتوں پر تقسیم کرنے کا فائدہ یہ ہے کہ مسئلے کا فہم وضبط آسان ہو جاتا ہے اور ہر جزئیہ اپنی جگہ درست معلوم ہوتا ہے۔

پہلی صورت:

اگر شوہر نے طلاق کی نسبت بیوی کی طرف نہ کی ہو، مگر وہ اپنی نیت بیوی کو طلاق دینے کی بیان کرتا ہے تو نیت کی وجہ سے اضافت موجود تسلیم کی جائے گی اور طلاق واقع ہوگی:

"......عدم وقوع آں وقت است کہ ارادۂ طلاق زن نہ باشد، نہ عرف جاری باشد۔"[1]

"وقوع طلاق کی اضافت لفظی ضروری نہیں، بلکہ اضافت معنوی بھی کافی

---

[1] امداد المفتین، کتاب الطلاق، رسالہ حکم الانصاف، ص:۵۰۸

ہوجاتی ہے، اضافتِ معنویہ کے لیے نیت یا عرف دونوں میں سے کسی
ایک کا ہونا ضروری ہے۔''[1]

امداد الفتاویٰ کا جو مفصل اقتباس ماقبل میں گزرا، اس میں مذکور ہے کہ اضافت کا تحقق نیت سے بھی ہوتا ہے: ''دوم: نیت کمافی قولہ عینت امرأتی۔'' امداد الفتاویٰ میں ایک اور فتویٰ درج ہے، جس کا عنوان ہے: ''وقوع طلاق بلا تصریح اسم وبلا خطاب زوجہ'' اور جواب میں ذکر ہے کہ ''چونکہ دل میں اپنی ہی منکوحہ کو طلاق دینے کا قصد تھا، لہٰذا تینوں طلاقیں واقع ہوگئیں۔[2]

''......اس نے طلاق کی نسبت اور اضافت اپنی بیوی کی طرف نہیں کی اور نہ اس کا نام لیا، نہ اشارہ کیا اور اس کی غرض بھی اپنی زوجہ کو طلاق دینے کی نہ تھی، لہٰذا اس صورت میں اس کی زوجہ پر طلاق واقع نہیں ہوئی۔''[3]

''...... ہرگاہ زید نگفتہ است کہ ازیں لفظ طلاق طلاق، زوجہ ام مرادنیست، زوجہ اش مطلقہ شود بدو طلاق، وہرگاہ بعد ازاں دراں مجلس یا مجلس دیگر گفتہ کلمات......ازیں لفظ یک طلاق بائنہ برزوجہ اش واقع شد......''[4]

دوسری صورت:

تمام اردو اور عربی فتاویٰ اس پر متفق ہیں کہ اگر لفظوں میں اضافت ہو تو وقوعِ طلاق میں کوئی شک وشبہ نہیں، مثلاً: شوہر اپنی بیوی کا نام لے یا اس کا نسب یا کنیت یا لقب یا

---

[1] مفتی ولی حسن، ۲۳ ربیع الثانی ۱۳۹۳ھ ماخوذ از رجسٹر: ۱۰، ص: ۱۴

[2] امداد الفتاویٰ، ج: ۲، ص: ۴۲۷، ط: مکتبہ دار العلوم کراچی

[3] فتاویٰ دار العلوم دیوبند، کتاب الطلاق، ۹/ ۱۳۴ ط: دار الاشاعت کراچی

[4] فتاویٰ دار العلوم دیوبند، ج: ۹، ص: ۱۲۹، ط: دار الاشاعت کراچی

عرفیت ذکر کرے:

”...لو ذكر اسمها أو اسم أبيها أو اسم أمها أو ولدها، فقال: عمرة طالق أو بنت فلان أو بنت فلانة أو أم فلان، فقد صرحو بأنها تطلق...“۔[1]

تیسری صورت:

تیسری صورت یہ ہے کہ شوہر کے کلام میں تو بیوی کی طرف اضافت نہ ہو، مگر اس کا کلام کسی ایسی بات کے جواب میں ہو جس میں اضافت مذکور ہو تو اصول فقہ کے قاعدے اور زبان کے محاورے کے تحت اضافت موجود مانی جائے گی، کیوں کہ یہ اصولی قاعدہ ہے کہ جواب میں سوال کا اعادہ ہوتا ہے اور عرف عام میں ایک ”ہاں“ یا ”نا“ کو لمبی چوڑی تقریر کا جواب سمجھا جاتا ہے۔ علامہ شامیؒ لکھتے ہیں:

”وفي الخانية: قالت له: طلقني ثلاثا فقال فعلت، أو قال طلقت وقعن...ان طلقني أمر بالتطليق، وقوله طلقت تطليق فصح جوابا، والجواب يتضمن إعادة مافي السؤال۔“[2]

امداد الفتاویٰ کے حوالے سے گزر چکا ہے کہ:

”سوم: اضافت در کلام سائل کما فی قولہ ”دادم“ فی جواب قولھا ”مرا طلاق دہ“ ولہٰذا ثلث واقع شود لتکرارھا ثلاثا۔“

کفایت المفتی میں بھی اس مضمون کا فتویٰ مذکور ہے:

”سوال: زید نے اپنی منکوحہ کے بارے میں بحالت غصہ زبان سے تین طلاق

---

[1] ردالمحتار کتاب الطلاق، مطلب سن بوش یقع بہ الرجعی، ۳/۲۴۸، ط: سعید

[2] ردالمحتار، ۳/۲۹۴، ط: سعید

کا لفظ نکالا، بلا اضافت کسی کے، زید نے جو تین طلاق کا لفظ زبان سے نکالا تو زید کے دل میں کچھ بھی نہیں تھا؟

جواب: اگر زید نے زبان سے صرف یہ لفظ نکالا تین طلاق، اس کے علاوہ اور کچھ نہیں تو ظاہر ہے کہ اس میں اضافت طلاق نہیں ہے، لیکن اگر یہ لفظ سوال کے جواب میں کہے ہوں، مثلاً: زوجہ یا اس کے کسی ولی یا رشتہ دار نے زید سے کہا کہ اپنی زوجہ کو طلاق دے دو اور زید نے کہا کہ تین طلاق تو اس صورت میں قرینہ حالیہ اضافت الی المنکوحہ کے ثبوت کے لیے کافی ہوگا اور قاضی طلاق کا حکم کرے گا............اب چونکہ مجلس قضا کا وجود بھی نہیں ہے، اس لیے حکم دیانت یہ ہے کہ زید کو کہا جائے گا کہ اگر تو نے اپنی بیوی کو یہ لفظ کہا تھا تو طلاق مغلظہ ہوگئی اور اگر بیوی کو نہیں کہا تھا تو طلاق نہیں ہوئی۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کا حکم ہے اور لوگوں کے اطمینان کے لیے اس سے حلف لیا جائے گا، اگر وہ حلف سے کہہ دے کہ میں نے بیوی کو تین طلاق نہیں کہا تھا تو لوگوں کو بھی اس کے تعلق زن شوئی سے تعرض نہیں کرنا چاہیے............''

درج ذیل جزئیات میں وقوعِ طلاق کی وجہ یہ ہے کہ سوال میں اضافت موجود ہے:

''لو قال: طالق، فقیل له: من عنیت؟ فقال: امرأتی، طلقت امرأته۔''[1]

ترجمہ:......''اگر شوہر نے کہا کہ طلاق ہے، اور جب اس سے پوچھا گیا کہ کس کو؟ تو اس نے کہا کہ میری بیوی کو، تو اس کی بیوی کو طلاق ہو جائے گی۔''

''قالت: طلاق بدست تو است، مرا طلاق کن' فقال الزوج: ''طلاق می کنم''، وکرر ثلثًا، طلقت ثلثًا۔'' [2]

---

[1] ردالمحتار، کتاب الطلاق، ۲۴۸/۳، ط: سعید

[2] الفتاوی الھندیۃ، الفصل السابع، ج: ۱، ص: ۳۸۴، ط: رشیدیہ

ترجمہ:...... ''بیوی نے کہا: ''طلاق تیرے اختیار میں ہے، مجھے طلاق دے۔'' تو جواب میں خاوند نے کہا: ''میں طلاق دیتا ہوں'' اور تین مرتبہ یہ الفاظ دہرائے تو تین طلاقیں بیوی کو پڑ گئیں۔''

ہندیہ میں بحوالہ ذخیرہ مذکور ہے:

''سئل شمس الائمة الأوزجندی عن امرأة قالت لزوجها لو كان الطلاق بيدی لطلقت نفسی ألف تطليقة۔ فقال الزوج: ''من هزار دادم'' ولم يقل: ''دادم ترا'' قال: يقع الطلاق۔''[1]

ترجمہ:...... شمس الائمہ سے سوال ہوا کہ ایک عورت نے کہا کہ اگر طلاق میرے ہاتھ میں ہوتی تو میں اپنے آپ کو ہزار طلاقیں دے ڈالتی، جس کے جواب میں شوہر نے کہا کہ میں نے ہزار دے دیں اور یہ نہ کہا کہ تجھے دیں تو امام شمس الائمہؒ نے فرمایا کہ طلاق ہوگئی۔

بعض جزئیات میں شوہر کا کلام بیوی کے جواب میں ہے، مگر اس کے باوجود طلاق واقع نہیں ہے، جس کی وجہ یہ ہے کہ شوہر صرف بیوی کے جواب پر اکتفا نہیں کرتا، بلکہ کوئی زائد بات کہہ جاتا ہے جس سے اس کا کلام بیوی کا جواب نہیں رہتا، بلکہ ابتدائی کلام بن جاتا ہے اور اضافت کی شرط مفقود ہونے سے طلاق بھی واقع نہیں ہوتی:

''سئل نجم الدين عمن قالت له امرأته مرا برگ باتو باشيدن نيست، مرا طلاق ده، فقال الزوج: چون تو روئے طلاق داده شد وقال لم أنو الطلاق هل يصدق؟ قال: نعم، ووافقه فی هذا الجواب بعض الائمة۔''[2]

ترجمہ:...... ''امام نجم الدینؒ سے ایک ایسے شخص کے متعلق سوال کیا گیا

---

[1] الفصل السابع الطلاق بالالفاظ الفارسية، ۱/۳۸۴ ط: پشاور

[2] الفتاوی الهندية، ۱/۳۸۵ ط: پشاور

جس سے اس کی بیوی نے کہا کہ میرا تمہارے ساتھ گزارہ نہیں ہوتا، مجھے طلاق دے دے، شوہر نے کہا: تیری جیسی شکل والی کو طلاق دی ہوئی ہے اور کہتا ہے کہ میری نیت طلاق کی نہیں تھی تو کیا اس کی بات معتبر ہوگی؟ تو امام نجم الدینؒ نے فرمایا کہ: ہاں! بعض ائمہ کا بھی یہی جواب ہے۔''

چوتھی صورت:

یہ ہے کہ شوہر کے کلام میں اضافت مذکور ہو، نہ ہی اس کا کلام جواب کے طور پر ہو، لیکن عرف میں وہ لفظ یا تعبیر طلاق کے لئے مخصوص ہو اور جب وہ لفظ بولا یا تعبیر اختیار کی جاتی ہو تو اس سے بیوی کو طلاق دینا ہی سمجھا جاتا ہو، جیسے: ''طلاق مجھ پر لازم ہوگی یا حرام مجھ پر لازم ہوگا''۔ حضرت مولانا انور شاہ کشمیریؒ کے جس رسالے کا پیچھے حوالہ گزر چکا ہے، وہ دراصل ایک ایسے سوال کے جواب میں تحریر کیا گیا ہے کہ شوہر نے طلاق دی مگر بیوی کی طرف اضافت نہیں کی، حضرت کشمیریؒ نے شوہر کے عرف کو بنیاد بناتے ہوئے لفظی اضافت کے بغیر بھی وقوع طلاق کا فتوی دیا۔ امداد الفتاویٰ میں بھی ہے کہ عرف ہو تو اضافت موجود مانی جائے گی۔ مفتی ولی حسن ٹونکیؒ ایک سوال کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں:

> ''............وقوع طلاق کے لیے اضافت لفظی ضروری نہیں، بلکہ اضافت معنوی بھی کافی ہوجاتی ہے، اضافت معنویہ کے لیے نیت یا عرف دونوں میں سے کسی ایک کا ہونا ضروری ہے۔ آج کل عرف عام ہے کہ لوگ ان الفاظ سے بیویوں کو طلاق دیتے ہیں...... حاصل کلام یہ ہے کہ یہاں نیت اور عرف موجود ہیں، اس لیے اضافت معنویہ کا تحقق ہوگیا......''[1]

---

[1] کتبہ (مفتی) ولی حسن، ۲۳ ربیع الثانی ۱۳۹۳ھ ماخوذ از رجسٹر: ۱۰، ص: ۱۴

شامی میں ہے:

"وسيذكر قريبا أن من الألفاظ المستعملة:الطلاق يلزمني، والحرام يلزمني،وعلى الطلاق،وعلى الحرام،فيقع بلا نية للعرف الخ، فأوقعوا به الطلاق مع أنه ليس فيه إضافة إليها صريحا، فهذا مؤيد لما في القنية، وظاهره أنه لا يصدق في أنه لم يرد امرأته للعرف، والله أعلم...وإنما كان ما ذكره صريحا، لأنه صار فاشيا في العرف استعماله في الطلاق،لايعرفون من صيغ الطلاق غيره،ولا يحلف به إلا الرجال،وقد مر أن الصريح ما غلب في العرف استعماله في الطلاق، بحيث لايستعمل عرفا إلا فيه من أي لغة كانت..."[1]

ترجمہ:......''مصنف عنقریب بیان کریں گے کہ طلاق کے لیے مستعمل الفاظ میں سے یہ بھی ہیں کہ: 'طلاق مجھ پر لازم ہوگی، حرام مجھ پر لازم ہوگا، مجھ پر طلاق اور مجھ پر حرام' نیت نہ ہو پھر بھی عرف کی وجہ سے ان الفاظ سے طلاق واقع ہوجائے گی...... بیوی کی طرف صریح اضافت نہ ہونے کے باوجود ان سے طلاق کو واقع قرار دینے سے قنیہ کی عبارت کی تائید ہوتی ہے۔ ظاہر یہ ہے کہ اگر شوہر کہے کہ میرا مقصد اپنی بیوی کو طلاق دینا نہ تھا تو اس کی تصدیق نہیں کی جائے گی، کیوں کہ عرف میں اس سے طلاق مراد ہوتی ہے...... مصنف نے جو لفظ ذکر کیا ہے، وہ صریح اس وجہ سے ہے کہ عرف میں طلاق کے لیے اس کا استعمال بہت ہی عام ہے، لوگ اس کے علاوہ طلاق کا کوئی لفظ جانتے ہی نہیں ہیں، اور مردوں کے علاوہ کوئی اس کے ذریعہ حلف بھی نہیں اٹھاتا ہے، پہلے گزر چکا ہے کہ صریح وہ ہے جس کا عرف میں زیادہ استعمال طلاق کے لیے ہوتا

---

[1] عمدة الرعاية على شرح الوقاية،كتاب الطلاق،فصل في كنايات الطلاق،۲۸۱/۳، ط:دار الكتب العلمية،بيروت

ہو، چاہے جس زبان کا بھی ہو۔"

پانچویں صورت:

اگر معنوی اضافت موجود ہے، مثلاً شوہر اپنی بیوی سے مخاطب ہے، مگر وہ صاف لفظوں میں طلاق کی نسبت بیوی کی طرف نہیں کرتا ہے، نہ ہی اس کے الفاظ کسی ایسے سوال کے جواب میں ہیں جس میں اس کی بیوی کی طرف اضافت موجود ہے اور وہ طلاق کے کوئی ایسے کلمات بھی استعمال نہیں کرتا جن سے اس کے عرف میں طلاق دینے کا رواج ہے تو پھر معنوی قرائن وشواہد کو زیرغور لایا جائے گا، اگر کوئی ایسا قرینہ موجود ہو جس سے غالب قیاس یہ بنتا ہو کہ شوہر کی مراد اپنی بیوی کو طلاق دینا ہے تو طلاق کے وقوع کا حکم کیا جائے گا، البتہ اگر شوہر کا بیان یہ ہو کہ اس کا ارادہ اپنی بیوی کو طلاق دینے کا نہ تھا تو اس سے حلف لیا جائے گا، کیونکہ قرینے کی وجہ سے اگر چہ وقوع طلاق کا احتمال قوی ہوجاتا ہے، مگر یقینی نہیں ہوتا اور اس کے کلام میں بہر حال طلاق کے علاوہ کی گنجائش موجود ہوتی ہے اور جب اس کا کلام محتمل ہے تو وہ رعایت کا بھی مستحق ہے، تاہم قرینے کی اور مضبوط قرینے کی موجودگی سے چونکہ اس کے موقف کے برخلاف وقوع کا ذہن بنتا ہے، اس لیے جس قدر رجان دار احتمال ہے اس کی تردید کے لیے دلیل بھی اسی قدر مضبوط ہونی چاہیے، اس لیے حلفیہ اس کے بیان کا اعتبار کیا جائے گا اور کوئی وجہ نہیں کہ حلف کے باوجود اسے سچا نہ سمجھا جائے۔ اگر غور کیا جائے تو حلف کی شرط طلاق کے اصولوں کے ہم آہنگ ہے، کیوں کہ کنایات میں بھی جب فیصلہ شوہر کے بیان پر ہوتا ہے تو اس سے حلف لیا جاتا ہے۔

"لا تخرجي إلا باذني فإني حلفت بالطلاق فخرجت لا يقع، لعدم ذكره حلفه بطلاقها، ويحتمل الحلف بطلاق غيرها فالقول له

ویؤیده ما ففی البحر، لو قال: امرأة طالق، أو قال: طلقت امرأة ثلاثا وقال: لم أعن امرأتی یصدق ویفهم منه أنه لو لم یقل ذالک تطلق امرأته لأن العادة أن من له امرأة إنما یحلف بطلاقها لا بطلاق غیرها فقوله: إنی حلفت بالطلاق ینصرف إلیها مالم یرد غیرها لأنه یحتمله کلامه۔"[1]

ترجمہ:.....شوہر نے بیوی سے کہا کہ ''میری اجازت کے بغیر باہر نہ جانا، کیوں کہ میں نے طلاق کی قسم کھائی ہے'' بیوی باہر نکل گئی تو طلاق نہ ہوگی، کیوں کہ شوہر نے یہ نہیں کہا ہے کہ اس نے اپنی بیوی کی طلاق کی قسم کھائی ہے، اس کے کلام میں یہ بھی احتمال ہے کہ اس نے بیوی کے علاوہ کسی اور کو طلاق دینے کی قسم کھائی ہو، اس احتمال کی وجہ سے خاوند کی بات قابل قبول ہوگی۔ اس کی تائید بحر کے جزیے سے بھی ہوتی ہے کہ اگر شوہر نے کہا کہ عورت کو طلاق ہے یا کہا کہ میں نے عورت کو تین طلاقیں دیں اور وضاحت یہ کی کہ میں نے اپنی بیوی مراد نہیں لی تھی تو اس کی بات کا اعتبار کیا جائے گا، اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر شوہر انکار کرے تو اس کی بیوی کو طلاق پڑ جائے گی، کیوں کہ عادت یہ ہے کہ جس کی بیوی ہو وہ کسی اور کی نہیں، بلکہ اپنی بیوی کو طلاق دینے کی قسم کھاتا ہے۔ بہر حال اس کے یہ کہنے سے کہ میں نے طلاق کی قسم کھائی ہے، اس کی اپنی ہی بیوی مراد ہوگی جب تک وہ بیوی کے علاوہ کوئی بیان نہ کرے، کیوں کہ اس کے کلام میں بیوی کے علاوہ کوئی اور مراد لینے کی گنجائش بہر حال موجود ہے۔

کفایت المفتی میں ہے:

---

[1] ردالمحتار، کتاب الطلاق، باب الصریح، ۳/۲۴۸، ط: سعید

''......اگر زید قسم کھا کر کہہ دے کہ میں نے اپنی بیوی کو یہ الفاظ نہیں کہے تھے تو اس کے قول اور قسم کا اعتبار کرلیا جائے گا اور طلاق کا حکم نہیں دیا جائے گا۔''[1]

جواب:......زید کے ان الفاظ (میں نے طلاق دی، اپنی والدہ سے مخاطب ہوکر اور پھر کہنا طلاق، طلاق، طلاق) میں جو سوال میں مذکور ہیں لفظ طلاق تو صریح ہے، لیکن اضافت الی الزوجہ صریح نہیں ہے، اس لیے اگر زید قسم کھا کر یہ کہہ دے کہ میں نے اپنی بیوی کو یہ الفاظ نہیں کہے تھے تو اس کے قول اور قسم کا اعتبار کیا جائے گا اور طلاق کا حکم نہیں کیا جائے گا۔[2]

سوال:......ایک شخص کا اس کی بیوی کے بھائیوں کے ساتھ جھگڑا تھا اور جھگڑے کا سبب بیوی تھی، اس نے یہ الفاظ کہے ''مجھ پر تین طلاق کے ساتھ مطلقہ ہے'' اپنی بیوی کا نام یا اس کی طرف نسبت نہیں کی تو طلاق واقع ہوئی یا نہیں؟

الجواب:......صورت مسئولہ میں جب بیوی کے حق میں یہ الفاظ ''مجھ پر تین طلاق کے ساتھ مطلقہ ہے'' کہہ دیے تو طلاق ہوگئی، اس لیے کہ طلاق بیوی کو ہی دی جاتی ہے، کسی اور کو نہیں دی جاتی، تاہم اگر شوہر قسم کھا کر کہہ دے کہ میری مراد بیوی نہیں تھی تو پھر طلاق واقع نہیں ہوگی۔

......اگر شوہر کہے کہ میں نے طلاق نہیں دی اور لفظ یہ بیوی کے حق میں نہیں کہا تو قسم کے ساتھ شوہر کا قول معتبر ہوگا۔[3]

---

[1] کفایت المفتی، ج:٦، ص: ۵۴، ط: دارالاشاعت

[2] کفایت المفتی، کتاب الطلاق، ٦/ ۵۴ ط: دارالاشاعت

[3] کفایت المفتی، ج: ۱۲، ص: ۲۷۴، ط: دارالاشاعت کراچی

چھٹی صورت:

اگر شوہر کے کلام میں اضافت کا احتمال بہت خفیف ہو تو طلاق کا وقوع شوہر کے بیان پر موقوف ہوگا، اگر وہ خود ہی وضاحت کردے کہ اس کی مراد اپنی زوجہ کو طلاق دینے کی تھی تو اقرار کے موافق وقوع طلاق کا حکم دیا جائے گا۔

یہ تفصیل اس صورت میں تھی کہ جب شوہر کا کلام لفظی اضافت سے تو خالی ہو، مگر کوئی ایسا قرینہ موجود ہو جس سے اغلب قیاس یہ بنتا ہو کہ شوہر کا مقصد اپنی بیوی تھا، لیکن اگر کوئی ایسا قرینہ بھی نہ ہو جو طلاق پر دلالت کرتا ہو تو طلاق کا وقوع شوہر کے بیان پر موقوف ہوگا، اگر وہ اضافت کا انکار کردے تو طلاق واقع نہ ہوگی اور اگر اقرار کرلے تو طلاق ہوجائے گی:

"سکران هربت منه امرأته فتبعها ولم يظفر بها فقال بالفارسية:" بسه طلاق" إن قال: عنيت امرأتي يقع،وإن لم يقل شيئا لايقع۔" [1]

"نشے والے سے اس کی بیوی بھاگ گئی، اس نے پیچھا کیا، مگر اسے پکڑ نہ سکا، تو اس نے فارسی میں کہا "بسہ طلاق" (تین طلاق کے ساتھ) تو اس صورت میں اگر وہ کہہ دے کہ میں نے اپنی بیوی مراد لے کر کہا ہے تو طلاق ہوگئی اور اگر کچھ نہ کہا تو طلاق نہ ہوگی۔"

"فرت ولم يظفر بها فقال:"سه طلاق"،إن قال: أردت امرأتي يقع وإلا لا۔" [2]

---

[1] الفتاوى الهنديه، كتاب الطلاق، ج١، ص:٣٨٢، ط:رشيدية

[2] ردالمحتار، كتاب الطلاق، باب الصريح، ٣/٢٤٨، ط:سعيد

''بیوی بھاگ گئی اور شوہر اسے پکڑ نہ سکا تو اس نے کہہ دیا ''تین طلاق'' اگر شوہر کہے کہ میں نے بیوی کے ارادے سے کہا ہے تو طلاق ہوگی، ورنہ نہیں۔''

"لو قال: "طالق"، فقيل له: من عنيت؟ فقال: "امرأتي"، طلقت امرأته." [1]

''ایک شخص نے کہا: ''طلاق ہے۔'' اس سے پوچھا گیا تو نے کس کو کہا ہے؟ تو اس نے کہا: ''اپنی بیوی کو''، تو اس کی بیوی کو طلاق ہو جائے گی۔''

ان آخری دو صورتوں کا فرق یہ ہے کہ پہلی صورت میں طلاق واقع سمجھی جاتی ہے اور اگر شوہر انکار کرتا ہے تو اسے حلف اٹھانا پڑتا ہے اور دوسری صورت میں طلاق کا وقوع ہی شوہر کے اقرار اور اظہار پر موقوف ہوتا ہے۔ اگر وہ کہہ دے کہ میرا ارادہ اپنی بیوی کو طلاق دینے کا تھا تو طلاق کے وقوع کا حکم کیا جائے گا۔ لیکن وہ خود بیان نہ کرے تو اس سے حلف لینے کی ضرورت نہیں ہے۔ گویا ایک میں وقوع اصل ہے اور عدم وقوع کے لیے حلف کی ضرورت ہے، جب کہ دوسری میں عدم وقوع اصل ہے اور وقوع کے لیے صرف شوہر کے بیان کی ضرورت ہے اور یہ فرق اس لیے ہے کہ ایک میں وقوع کا احتمال قوی ہوتا ہے اور دوسری میں ضعیف ہوتا ہے۔

---

[1] ردالمحتار، کتاب الطلاق، باب الصریح، ج:۳، ص:۲۴۸، ط:سعید

دلالت حال سے وقوعِ طلاق

سولہواں فائدہ

دلالت حال سے وقوع طلاق؟

کنایہ اگر صریح نہ ہو تو اس سے طلاق کا وقوع نیت یا دلالت پر موقوف رہتا ہے۔ مذہب حنفی اس سلسلے میں بالکل واضح ہے اور ماقبل میں تفصیل کے ساتھ اس کا بیان ہو چکا ہے، مگر خلافت عثمانیہ نے اپنی خلافت کے آخری ایام میں غیر صریح کنایہ سے طلاق کا وقوع صرف نیت کے ساتھ مشروط کر کے دلالت حال کو غیر معتبر قرار دے دیا تھا۔ زیر نظر سطور میں اس قانون کا جائزہ لیا جائے گا اور مقصود اس جائزے سے دلالت کی بحث کو جامع بنانا اور اس کے مختلف گوشوں کو واضح کرنا اور اہل علم کو اس پہلو سے غور و فکر کے لیے متوجہ کرنا ہے۔

مجلة الأحكام العدلية

انیسویں صدی کے وسط میں خلافت نے اہم نوعیت کے کئی قوانین نافذ کیے، جن میں ''قانون الجزاء'' اور ''قانون أصول المحاكمات الحقوقية والجزائية'' قابل ذکر ہیں۔ خلافت نے فقہ حنفی کو سرکاری حیثیت سے اختیار کیا تھا اور اس کی تنفیذ

کے لیے شرعی عدالتیں قائم تھیں، جب کہ وضعی قوانین کے نفاذ کے لیے خلافت نے ایک نیا نظام ''مجالس تمیز حقوق'' کے نام سے متعارف کرایا تھا۔ ''مجالس تمیز حقوق'' شرعی عدالتوں کے ماتحت ایک عدالتی نظام تھا اور اس کے عام ارکان براہِ راست فقہ اسلامی سے واقفیت نہیں رکھتے تھے، جس کا نتیجہ یہ نکلتا کہ جب ان ماتحت عدالتوں کے فیصلے بالائی عدالتوں میں پیش ہو کر مسترد ہو جاتے تو وضعی اور شرعی قوانین کے مابین اختلاف اور تضاد و تصادم کھل کر سامنے آجاتا اور خود ان عدالتوں کے حکام کے درمیان تناؤ اور کشیدگی کی کیفیت پیدا ہو جاتی تھی۔

تجارتی و کاروباری معاملات کے سلسلے میں بھی خلافت کو اسی نوعیت کی دشواری درپیش تھی۔ اگر غور کیا جائے تو اس دشواری کا تعلق نظامِ عدل کی استواری اور عدم استواری سے تھا کہ اسے اس طرح منظم نہیں کیا گیا تھا کہ ایک کل کی مختلف اکائیاں آپس میں ٹکراتی ہوئی محسوس نہ ہوں، مگر اس دشواری کے علاوہ ایک اور مشکل بھی تھی جس کا تعلق نظام عدل سے نہیں، بلکہ خود قانون کی جامعیت اور عدم جامعیت سے تھا۔ تجارت اور کاروباری معاملات کے متعلق جو قانون رائج تھا وہ تجارت اور تجارتی معاملات کے تمام پہلوؤں کا احاطہ اور اس کے جملہ مسائل واحکام کا استیعاب نہیں کرتا تھا، چنانچہ بعض اوقات اس نوعیت کے مقدمات دائر ہو جاتے، جن کو نافذ الوقت قانون کے تحت فیصل کرنا ممکن نہیں ہوتا تھا۔ عدالتیں فصلِ خصومات اور رفعِ تنازعات کے سلسلے میں کسی اجنبی قانون سے بھی استفادہ کی مجاز نہ تھیں، کیونکہ سلطنت کی طرف سے اسے منظوری حاصل نہ تھی۔ ماتحت عدالتوں کے سامنے براہِ راست فقہ اسلامی سے رہنمائی حاصل کرنے کا راستہ کھلا پڑا تھا، مگر ارکانِ عدالت اس آسان و مختصر، مامون و مفید اور کھلے اور کشادہ راستے کو آمد و رفت کے لیے استعمال نہیں کر سکتے تھے، کیونکہ فقہ اسلامی ان کے مزاج اور

ذوق کے مطابق اس عہد کے عدالتی اور قانونی طرز واسلوب میں مدون نہ تھا اور قدیم شکل میں اس بحر ناپید کنار سے استنباط واستخراج کا ان کو ملکہ اور قدرت نہ تھی۔

اس مشکل کا ایک حل یہ تھا کہ دیوانی عدالتوں میں دائر مقدمات کو پھر سے شرعی عدالتوں میں دائر کیا جاتا، مگر اس طرح شرعی عدالتوں کے بوجھ میں ناقابل برداشت حد تک اضافہ ہوجاتا، کیوں کہ وہ پہلے سے ہی کام کے دباؤ سے جھکی چلی جارہی تھیں اور اگر شرعی عدالتیں اس اضافی بوجھ کو کسی طرح سہار جاتیں تو پھر بھی بنیادی مشکل کا ازالہ اور اصل الجھن کا خاتمہ ممکن نہ تھا، کیوں کہ اگر شرعی عدالت کا فیصلہ ماتحت عدالتی فیصلے سے برعکس آجاتا تو ایک ہی مقدمہ میں ایک ہی ملک کی دوعدالتوں کے دومتضاد فیصلے سامنے آتے، جس سے عدالتی انتشار اور عدالتی حکام کے مابین تناؤ میں مزید اضافہ ہوجاتا۔ ان وجوہات کی بنا پر اور قانون سازی کی اس خوشگوار لہر کے نتیجے میں جو اس زمانے میں چلی تھی اور کچھ تجارتی، عسکری اور سفارتی عوامل کی بنا پر سلطنت نے محسوس کیا کہ حصۂ معاملات پر بھی ایک قانونی مجموعہ مرتب کرنا انتہائی قرین مصلحت ہے، چنانچہ اعلیٰ عدلیہ، ماہرین قانون، مجلس شوریٰ کے اراکین اور ممتاز فقہاء پر مشتمل ایک بورڈ تشکیل دیا گیا، جس نے ۱۸۶۵ء سے ۱۸۷۶ء تک بیس سال کی سعی پیہم اور جہد مسلسل سے باقاعدہ ابواب اور دفعات پر مشتمل ایک ضابطہ بند مجموعہ تیار کرلیا، جسے ''مجلة الأحكام العدلية'' کے نام سے موسوم کیا گیا۔ مجلہ اٹھارہ سو اکیاون دفعات، سولہ ابواب اور ایک جامع مقدمہ پر مشتمل ہے اور مروجہ عدالتی اسلوب میں پہلی اسلامی دستاویز ہے۔ مجلہ کے مدونین نے ''مجلة الأحكام العدلية'' کی افادیت، اہمیت اور ضرورت کو بایں الفاظ بیان کیا ہے:

''ان وجوہ کی بنا پر شدت کے ساتھ ضرورت محسوس کی جاتی رہی کہ ایک کتاب قسمِ معاملاتِ فقہیہ پر ایسی تالیف کی جائے جس میں مسائل مربوط انداز میں مرتب ہوں۔ اس سے استفادہ آسان ہو، اختلافات کا اس میں ذکر نہ ہو، مقبول و مفتیٰ بہ اقوال پر مشتمل ہو اور ہر شخص کے لیے اس کا مطالعہ سہل ہو۔ اگر ایسی کتاب تیار ہو جائے تو اس سے حکام شرعی، ارکان محاکم نظامیہ اور افسران سر رشتہ ہائے انتظامی سب کو بڑا فائدہ پہنچے گا۔ اس کے مطالعے سے انہیں شرع سے یک گونہ ربط پیدا ہو جائے گا اور بقدر استطاعت دعاوی اور شرع شریف کے مابین توفیق کی ان میں قوت پیدا ہو جائے گی۔ اس طرح یہ کتاب محاکم شرعیہ میں اجرائے احکام کے لیے سند کا کام دے گی اور محاکم نظامیہ میں جن مقدمات حقوق کی سماعت ہوتی ہے، ان کے لیے کسی جدید قانون کے وضع کرنے کی ضرورت باقی نہ رہے گی۔''[1]

انیسویں صدی کے ربع اول میں خلافت کے خاتمے کے ساتھ مجلہ کی حکمرانی کا سورج بھی غروب ہو گیا، مگر اس کی حرارت وتمازت ہے جو آج بھی محسوس کی جا سکتی ہے۔ اسلامی ملکوں کویت و فلسطین خصوصاً اردن میں یہی دستاویز بعض اضافات اور مناسب اصلاحات کے ساتھ آج بھی نافذ ہے۔ مجلہ معاملات سے متعلق احکام اسلام پر مشتمل قانون ہے اور اس کا ماخذ فقہ حنفی کے راجح اور مفتیٰ بہ اقوال ہیں۔ جن بعض مسائل میں مجلہ نے مذہب حنفی سے عدول کیا ہے، مجلہ کے مدونین نے مقدمہ میں اس کے اسباب و وجوہات کا ذکر کر دیا ہے۔

---

[1] مجلة الأحكام العدلية، ص:۷۸، ط: دار ابن حزم، سن ۱۴۲۴ھ

قرار حقوق العائلة

عائلی قوانین سے مجلہ یکسر خاموش ہے اور حجر اور مرض الموت جیسے مسائل کے علاوہ اس کے کسی قانون کا تعلق پرسنل لاء (شخصی قوانین) سے جوڑ نا مشکل ہے۔ خلافت کا اس پہلو سے اغماض اس مصلحت سے تھا کہ اس کے قلمرو کے طول و عرض میں مختلف مذاہب و مسالک کے پیرو آباد تھے اور خلافت شخصی مسائل میں غیر مسلم رعایا کو ان کے مذہب کے مطابق آزادی دینے کی پالیسی پر کاربند تھی۔ شخصی معاملات میں عدم تقنین اور اس کے عدم نفاذ کا یہ سلسلہ ۱۹۱۷ء تک جاری رہا، یہاں تک کہ مختلف اسباب و وجوہات کی بنا پر خلافت نے ضرورت محسوس کی کہ شخصی معاملات میں بھی اپنے قلمرو میں ایک قانون کا نفاذ ہونا چاہیے، چنانچہ یکم محرم ۱۳۳۶ھ بمطابق ۱۷ اکتوبر ۱۹۱۷ء کو ''قرار حقوق العائلة فی النكاح المدنی والطلاق:النكاح ، الافتراق '' کے نام سے سلطنت نے ایک قانون نافذ کیا، جس میں مجلہ کی طرح غالب اقوال فقہ حنفی سے لیے گئے تھے، مگر بعض مسائل میں جہاں مذہب حنفی پر عمل سے تنگی اور دشواری پیش آرہی تھی اور احوال وظروف کی عدم رعایت سے مصالح شرعیہ فوت ہوتے محسوس ہو رہے تھے، وہاں دیگر مذاہب کے اقوال کو بنیاد بنا کر قانون سازی کی گئی، ان ہی مسائل میں ایک دلالت حال سے عدم وقوع طلاق کا مسئلہ بھی ہے، جو مذکورہ قانون کے دفعہ: ۱۰۹ میں درج ہے۔ مجلہ تو قدیم زمانہ سے مطبوع و متداول ہے، مگر پچھلے چند سالوں سے بیروت کے مطبع نے مجلہ کے ساتھ مذکورہ عائلی قانون بھی طبع کرنا شروع کر دیا ہے۔ اس قانون کی تمہید اور مقدمے میں تفصیل سے ان اسباب و محرکات پر روشنی ڈالی گئی ہے، جن کی بنا پر خلافت نے عائلی قوانین کے نفاذ کی ضرورت محسوس کی، قانون اور فلسفہ قانون کے بہت اہم نکات بھی متذکرہ مقدمے میں زیر بحث آگئے ہیں۔ دلالت حال سے عدم وقوع طلاق

کے بارے میں قانون ساز مجلس اپنے خیالات کا بایں الفاظ اظہار کرتی ہے:

”الألفاظ الكنائية المستعملة فی الطلاق: إيقاع الطلاق بالألفاظ الكنائية صحيح عند أهل جميع المذاهب، إنما إذا كانت هذه الألفاظ غير معروفة فوقوع الطلاق بها على المذهب المختار يتوقف على نية الزوج أو على دلالة الحال۔ فالزوج وإن لم يكن له حق إيقاع الطلاق بلفظ كنائی عمدا نظرا لأهليته للطلاق، غير أنه إذا كان لاينوی الطلاق، فاستنباط معنى من قوله غير مقصود منه استنادا على دلالة الحال، والقول بوقوع الطلاق مخالف للقاعدة القائلة بوجوب العناية بصيانة النكاح ووقاية حياة العائلة من الخلل۔ وقوع الطلاق بالألفاظ الكنائية عند الإمام الشافعی رحمه الله يتوقف على النية مطلقا، وفی الحقيقة أن الطلاق يقع بلفظ كنائی إذا نوى الزوج سواء وجدت دلالة أولم توجد، والقول بوقوع الطلاق باستنباط معنى غير مقصود من قول الزوج، ولا نوى الطلاق به، لم ير موافقا للمصلحة، ولذا نظمت المادة ١٠٩ على القول الإمام المشار إليه۔“[1]

ترجمہ:...... ”کنایہ الفاظ جو طلاق کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں: تمام مذاہب میں کنایہ الفاظ سے طلاق دینا صحیح ہے، لیکن جب یہ الفاظ متعارف نہ ہوں تو مختار مذہب کے مطابق ان سے طلاق کا وقوع نیت یا دلالتِ حال پر موقوف رہتا ہے۔ اگر چہ اس پہلو سے شوہر کو کنایہ لفظ سے جان بوجھ کر طلاق دینے کا حق نہیں ہے کہ وہ لفظ طلاق سے طلاق دینے کی اہلیت رکھتا ہے، مگر جب اس کی نیت طلاق کی نہ ہو تو اس کے الفاظ سے دلالتِ حال کی

---

[1] قرار حقوق العائلة في النكاح المدني والطلاق: النكاح۔ التفريق على مجلة الأحكام العدلية، ص:٥١٣، ط:دار ابن حزم

بنا پر ایک ایسا معنی برآمد کرنا جو اس کا مقصد نہ ہو اور اس کی بنا پر وقوع طلاق کا حکم صادر کرنا اس عام اصول کے خلاف ہے جو نکاح کے تحفظ اور عائلی زندگی کو متاثر ہونے سے بچانے کی تاکید کرتا ہے۔امام شافعیؒ کے نزدیک کنایہ الفاظ سے طلاق کا وقوع بہر صورت نیت پر موقوف ہے۔حقیقت یہ ہے کہ جب شوہر کی نیت ہو تو کنایہ لفظ سے طلاق ہو جاتی ہے چاہے دلالت حال ہو یا نہ ہو،لیکن شوہر کے قول سے ایک ایسا معنی اخذ کر کے طلاق کا حکم صادر کرنا جو معنی شوہر کا مقصود نہ ہو اور جس سے اس نے طلاق کا ارادہ بھی نہ کیا ہو،خلاف مصلحت معلوم ہوتا ہے، اس لیے دفعہ: ۱۰۹ کو امام شافعی v کے مذہب کی اساس پر مدون کیا گیا ہے۔

دفعہ:۱۰۹ کی تمہید ملاحظہ فرمانے کے بعد اب اصل دفعہ ملاحظہ کیجیے:

"(مادة: ۱۰۹)یقع الطلاق بالألفاظ الصریحة والألفاظ الکنائیة المتعارفة بحکم الصریحة۔أما وقوع الطلاق بالألفاظ الکنائیة غیر المتعارفة، فمتوقف علی نیة الزوج۔ إذا اختلف الطرفان فی نیة الزوج للطلاق یصدق الزوج بیمینه۔"[1]

ترجمہ:......"صریح الفاظ سے اور ان کنایہ الفاظ سے جن سے طلاق دینا متعارف ہے اور وہ صریح کے حکم میں ہیں،ان سے طلاق واقع ہو جاتی ہے۔جن کنایہ الفاظ سے طلاق دینے کا عرف نہیں ہے ان سے طلاق کا وقوع شوہر کی نیت پر موقوف ہے۔ جب زوجین کا اختلاف ہو جائے کہ (کنایہ غیر متعارفہ کے استعمال سے) شوہر کی نیت طلاق کی تھی یا نہیں تو شوہر کے قول کا حلف کے ساتھ اعتبار کیا جائے گا۔"

---

[1] الکتاب الثانی فی الافتراق ۵۳۴،الطبعة الاولی ۱۴۲۴ھ دار ابن حزم،بیروت

’’متعارف کنایات‘‘ سے وہی الفاظ مراد ہیں جن کو گزشتہ فوائد میں ملحق بالصریح سے تعبیر کیا گیا ہے، یعنی وہ الفاظ جو اپنی اصل وضع کے اعتبار سے کنایہ ہیں، مگر اس کثرت سے طلاق کے معنی میں استعمال ہوتے ہیں کہ اب صریح کے درجے میں آگئے ہیں اور وقوعِ طلاق کے لیے نیت کی احتیاج نہیں رکھتے ہیں۔

مذہب حنفی میں طلاق کا وقوع صریح یا نیت یا دلالت سے ہوتا ہے، جب کہ دفعہ ہذا طلاق کے وقوع کو صریح یا نیت میں منحصر کرتی ہے۔ اگرچہ دفعہ بالا دلالت حال کے غیر معتبر ہونے کی تصریح نہیں کرتی، مگر وقوع طلاق کو صرف صریح یا نیت میں منحصر کرنے کا لازمی نتیجہ دلالت کے خروج کی صورت میں نکلتا ہے۔ طلاق کے مباحث میں صریح سے مراد وہ لفظ ہوتا ہے جو کثرت سے طلاق کے معنی میں استعمال ہوتا ہو اور کثرت استعمال کا معیار عرف ہے، اس لیے اس دفعہ کا حاصل یہ نکلتا ہے کہ طلاق کا وقوع عرف یا نیت سے ہوگا۔

تائیدی دلائل

دفعہ بالا کی تمہید میں مقننہ نے خود ہی وضاحت کر دی ہے کہ متذکرہ دفعہ کی بنیاد مذہب شافعیؒ پر رکھی گئی ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ امام شافعیؒ اس مسئلے میں تنہا نہیں، بلکہ امام مالکؒ کی رائے بھی ان کے موافق ہے۔ حنابلہ اس مسئلے میں حنفیہ کے ہم خیال ہیں، مگر شوافع اور مالکیہ کے متفق ہونے سے ائمہ اربعہ کے درمیان آراء کا تناسب برابر ہوجاتا ہے، اس کے ساتھ حنفی اصول افتا کی یہ شرط بھی پوری ہوجاتی ہے کہ مذاہب میں سے پہلے مذہب مالکی پھر شافعی اور پھر حنبلی کو بالترتیب اختیار کیا جائے گا۔

مذہب حنفی سے خروج کے وقت اور کسی دوسرے مذہب کو اختیار کرتے وقت ترتیب کیا ہوگی؟ یہ سوچ بعد کے مرحلے کی ہے، اس ترتیب وانتخاب سے پہلے نفس خروج

کو شرعی جواز فراہم کرنا ضروری ہے۔ شرعی جواز مہیا کرنے کے لیے سب سے پہلے اکابر اہل فتویٰ کا یہ اطمینان ضروری ہوگا کہ آیا واقعی خروج عن المذہب کی شرائط پوری ہیں؟ اور مذہب حنفی میں دشواری اور کسی دیگر مذہب میں سہولت ہے؟ اور عوام الناس کے حالات بھی سہولت کے مقتضی ہیں؟ اور مذہب حنفی پر عمل سے کوئی قابل اعتبار مصلحت فوت ہو رہی ہے یا خاطر خواہ مفسدہ لازم آرہا ہے؟

آج کے حالات میں اس قسم کے سوالات موزوں ہو یا غیر موزوں، اپنے اندر معقولیت رکھتے ہوں یا سراسر غیر معقول ہوں، مگر تین براعظموں پر پھیلی خلافت نے اپنے زمانۂ اقتدار میں ان سوالوں کو اہمیت دی ہے اور سب سوالات کا مثبت جواب دیا ہے۔ ایک واقعی مسئلہ ہونے کی حیثیت سے خلافت نے نہ صرف اس کا ادراک کیا، بلکہ عملی قدم اٹھاتے ہوئے قانون سازی بھی کر ڈالی، اب حل طلب سوال ہمارے سامنے یہ ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس باعث اور محرک کی شدت و اہمیت میں اضافہ ہوا ہے یا مقتضیات ختم اور ضرورت رفع ہوگئی ہے؟

اسلامی ممالک میں سے مصر اور سوڈان وغیرہ نے بھی اس مسئلے میں خلافت کی تقلید کی ہے، متحدہ عرب امارات، شام اور اردن کا قانون بھی اس نہج پر ہے کہ کنایات میں دلالتِ حال کا اعتبار نہیں۔

شیخ علی الخفیف اپنی کتاب ''فرق الزواج فی المذاهب الإسلامية'' میں لکھتے ہیں:

''وذهب المالكية والشافعية: إلى أن نية الطلاق شرط في وقوع الطلاق بالكنايات، ولا عبرة بدلالة الحال عندهم، إذ إن المطلق

مختار فی إرادة غير الطلاق منها، وقيام القرينة لا ينفی اختياره فی ذلک۔ وعليه العمل الآن بالجمهورية العربية المتحدة، بمقتضى المادة رقم:۴من القانون رقم:۲۵لسنة ۱۹۲۹ءونصها: "كنايات الطلاق، وهی مايحتمل الطلاق وغيره، لايقع بها الطلاق إلا بالنية، وعلى هذا لو ادعى الناطق بأی لفظ من ألفاظ الكنايات أنه لم ينو به الطلاق، لم يقع به طلاق، مهما كانت الحال۔ وكذلک جرى العمل فی المحاكم السودانية، منذ سنة ۱۹۳۵ء بناء على المنشور الشرعی رقم: ۴۱"[1]

اردن کا قانون ملاحظہ کیجیے:

"يقع الطلاق بالألفاظ الصريحة دون الحاجة إلى النية، وبالألفاظ الكنائية، وهی التی تحتمل معنی الطلاق وغيره بالنية"[2]

اہل زمانہ کے حالات پر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ سلطنت عثمانیہ نے اور اس کی متابعت میں برادر اسلامی ممالک نے مسلم معاشرے کی بروقت اور درست تشخیص کی ہے۔ غور کیجیے اور غور کرتے وقت دین دار اقلیت کو نہیں، بلکہ اس اکثریت کو پیش نظر رکھیں جن کا دین کے ساتھ محض رسمی تعلق ہے کہ کتنے لوگ ہیں جو "جا، چل، نکل، اٹھ، کھڑی ہو" وغیرہ کو طلاق کے الفاظ سمجھتے ہیں۔ لوگوں کی اکثریت صرف لفظ طلاق اور اس کے مشتقات کو اور گنتی کے چند اور الفاظ کو، جن کو سلطنت نے متعارف کنایات سے تعبیر کیا ہے، طلاق کے الفاظ سمجھتی ہے۔ اب اگر شوہر کوئی کنایہ لفظ استعمال کرے اور وہ

---

[1] فرق الزواج في المذاهب الإسلامية للعلامة الشيخ علي الخفيف، تحت عنوان الكناية في الطلاق وحكمها: الطبعة الأولى، ١٠٣، ط: دار الفكر العربي، القاهرة، مصر

[2] قانون الأحوال الشخصية لسنة (٢٠١٠) الباب الرابع انحلال عقد الزواج، الفصل الأول الطلاق، مادة: ۴۸

اسے طلاق کا لفظ نہ سمجھتا ہو، مگر اس وجہ سے کہ وہ لفظ غصہ یا مذاکرہ کے وقت بولا گیا ہے، اس سے وقوع طلاق کا حکم دیا جائے تو وہی قباحت لازم آئے گی کہ شوہر کے الفاظ سے ایک ایسا معنی کشید کیا گیا ہے جس کا خود شوہر نے ارادہ نہیں کیا ہے۔

اس کے علاوہ ہمارے معاشرے میں طلاق کے مسائل میں خصوصاً طلاق کے وقوع اور عدم وقوع کے بارے میں عدالتوں سے رجوع کا رجحان بہت کم بلکہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ لوگ مفتیان حضرات سے رجوع کرتے ہیں اور مفتی کا اصل منصب دیانت پر فتوی ہے۔ دلالت حال پر فتوی اپنے اصل کے لحاظ سے مفتی کا نہیں بلکہ قاضی کا منصب ہے۔ اس لیے اگر دلالتِ حال کی بنا پر طلاق کے وقوع کو قاضی کا منصب قرار دیا جائے، جیسا کہ حقیقت میں بھی اسی کا منصب ہے اور مفتی کو دیانت پر فتوی کا پابند بنا دیا جائے تو اہل افتا اس سے کسی ایسے شرعی حق سے محروم نہیں ہوتے جو شریعت نے انہیں بخشا ہو۔

طلاق کے الفاظ میں سے کنایات اور کنایات میں وہ کنایہ الفاظ جو صریح نہیں ہیں، ان کا فہم اور تطبیق خود علما وفضلا کے لیے بھی نہ صرف مشکل بلکہ بہت مشکل ہے۔ یہ ایک تلخ حقیقت ہے، لیکن بہر حال حقیقت ہے اور اسے تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں۔ خلافت کے بنائے ہوئے قانون میں اہل علم کو بڑی سہولت ہے، کیوں کہ اس قانون کی رو سے کنایات اور احوال کی تقسیم کی ضرورت نہیں رہے گی اور طلاق کا وقوع صرف صریح یا نیت سے ہوگا اور اس کا عملی نتیجہ ہمارے معاشرے میں اس طرح ظاہر ہوگا کہ کنایہ الفاظ سے طلاق کا وقوع لفظ حرام، آزاد اور چھوڑ دیا وغیرہ تک محدود ہو جائے گا اور جو غیر صریح کنایہ ہیں ان میں شوہر کی نیت لازم ہوگی۔

قانون سازی جیسے سنجیدہ اور خالص علمی بحث میں اس جیسی نکتہ طرازی اور دقیقہ سنجی کو شاید ظرافت طبع اور لطافت حس پر محمول کر کے نظر انداز کر دیا جائے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ مشائخ نے حیض وغیرہ کے مسائل میں بعض اقوال کو اس وجہ سے بھی پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا ہے کہ ان کے فہم میں سہولت اور ضبط میں آسانی ہے اور اس سے زیادہ سچی حقیقت یہ ہے کہ سہولت کے لیے وجوہِ ترجیح تلاش کرنا ہی ضروری نہیں ہے، کیوں کہ سہولت خود وجہ ترجیح ہے۔

تردیدی دلائل

یہاں تک سلطنت عثمانیہ کے بنائے ہوئے ایک ایسے قانون کا ذکر تھا جس میں دلالت حال کو غیر معتبر قرار دیا گیا تھا اور اس کی تائید میں محض رائے کے درجے میں چند طالب علمانہ گزارشات بھی کی گئیں۔ اب ہم مسئلے کا دوسرے پہلو سے جائزہ لیتے ہیں، کیوں کہ مقصود فیصلہ نہیں، بلکہ مسئلے کا ہر پہلو سے جائزہ ہے۔

کنایہ اگر صریح نہ ہو تو اس سے طلاق کا وقوع نیت یا دلالت پر موقوف رہتا ہے۔ یہی مذہب حنفی ہے، اسی پر فتوی ہے اور اس پر تمام حنفی فقہاء کا اتفاق ہے اور متون وشروح اور فتاوی وحواشی سب میں اس کی صراحت ہے۔ دلالت حال کا اعتبار نہ کرنے سے مذہب حنفی کی صریح مخالفت لازم آئے گی اور اس مخالفت کا عملی نتیجہ یہ نکلے گا کہ طلاق کا وقوع صرف صریح اور نیت میں منحصر ہو جائے گا اور دلالت کی بحث اور اس کے تحت فقہاء کی نکتہ سنجیاں اور دقیقہ رسیاں سب کی سب اعتاق اور تدبیر کے مسائل کی طرح محض کتابوں کی زینت رہ جائیں گی۔

خلافت عثمانیہ کے قانون ساز ادارے نے مذکورہ قانون کو سند جواز فراہم کرنے

کے لیے یہ دلیل دی ہے کہ دلالت کا اعتبار کرنے سے شوہر کے کلام سے ایک ایسے معنی کا استنباط لازم آتا ہے جس کا شوہر نے قصد نہیں کیا ہے۔ یہ دلیل اس اطلاق کے ساتھ درست نہیں معلوم ہوتی۔ یہ تو درست ہے کہ کسی لفظ سے ایسا معنی برآمد کیا جا سکتا ہے جس کی لفظ میں گنجائش ہی نہ ہو، نہ ہی کلام کو متکلم کے خلافِ مقصود معنی پہنائے جا سکتے ہیں ،مگر دلالت حال میں لفظ سے متکلم کی منشا کے خلاف معنی مراد لیا جاتا ہے، ایسا ہرگز تسلیم نہیں، کیوں دلالت کے مسئلے میں لفظ کے اندر معنی کی گنجائش ہوتی ہے، البتہ وہ معنی شوہر کا مقصود ہے یا نہیں؟ اس بارے میں دلیل کی ضرورت ہوتی ہے اور دلالت کی صورت میں قرینہ اس بات کی کافی دلیل ہوتا ہے کہ شوہر کی مراد طلاق ہے۔ کنایہ کی حقیقت ہی یہ ہے کہ شوہر خاص ماحول میں خاص طرح کے الفاظ استعمال نہ کرے، بصورتِ دیگر شریعت طلاق کا قیاس کرنے میں حق بجانب ہوگی۔ اس تنبیہ کے بعد جب شوہر ایک خاص قسم کے ماحول میں ایک ذو معنی لفظ استعمال کرتا ہے تو طلاق اور غیر طلاق کا مساوی قیاس پیدا ہو جاتا ہے، مگر قرینہ کی موجودگی سے ماحول شوہر کے خلاف بن جاتا ہے اور یہ قیاس غلبہ کے ساتھ ابھر جاتا ہے کہ شوہر نے طلاق ہی کی نیت سے کنایہ کا استعمال کیا ہے۔ اس لیے یہ بالکل معقول ہے کہ جس طرح شوہر کے اظہار و بیان سے اس کی نیت ثابت ہوتی ہے، اسی طرح شواہد و آثار اور قرائن و علامات سے بھی اس کی نیت اخذ کی جا سکتی ہے۔ ظاہری نگاہ میں یہ اصول کچھ بھیانک اور خوفناک معلوم ہوتا ہے کہ دلالت حال سے بھی نیت برآمد کی جا سکتی ہے، مگر فقہاء نے اس اصول کی اتنی سخت تعبیر کی ہے کہ عملی طور پر کنایات سے طلاق کا وقوع بہت مشکل ہو جاتا ہے۔

مذکورہ قانون کے جواز پر مقننہ نے دوسری دلیل یہ دی ہے کہ شوہر کے قصد کے برخلاف طلاق کے وقوع سے عائلی زندگی سخت متاثر ہوتی ہے اور خاندانی نظام برباد ہو کر

رہ جاتا ہے، مگر شریعت اس کے قصد کے برخلاف طلاق کے وقوع کا حکم نہیں کرتی، بلکہ صرف اس کے قصد کو اس پر لازم کر دیتی ہے۔

ایک اور پہلو سے دیکھا جائے تو دلالت کو نیت کے قائم مقام قرار دینے میں بڑی حکمت پوشیدہ نظر آتی ہے۔ کنایہ الفاظ کی فہرست پر ایک نگاہ ڈال لی جائے تو ہر ہر لفظ زہر میں بجھا ہوا تیر محسوس ہوتا ہے، بھاڑ میں جا، دفع ہو جا، جہنم میں جا، چاروں راستے کھلے ہوئے ہیں، مجھے تیری ضرورت نہیں، اس قسم کے الفاظ روح کو گھائل اور جذبات کو سخت مجروح کرتے ہیں، جس کا لازمی نتیجہ ناچاقی اور تلخی اور ازدواجی زندگی کی ناکامی کی صورت میں نکلتا ہے، اگر شوہر کو یہ ضمانت مل جائے کہ گول مول الفاظ سے اس وقت تک طلاق نہیں ہوگی جب تک وہ خود طلاق کی نیت کا اظہار نہیں کرے گا تو وہ اسی طرح چبھن اور کاٹ کے الفاظ استعمال کرتا رہے گا اور بیوی کے پاس سوائے کُھلنے، گھٹنے اور کڑوے گھونٹ پینے کے اور کوئی چارہ نہ ہوگا۔

اس کے علاوہ ایک اور پہلو سے بھی یہ مسئلہ غور و فکر چاہتا ہے۔ اگر شوہر تین مرتبہ طلاق کے صریح الفاظ استعمال کرے اور اپنی نیت تاکید کی بیان کرے تو اس کے کلام میں تاکید کی گنجائش ہوتی ہے اور از روئے دیانت اس کی نیت کا اعتبار بھی ہوتا ہے، مگر پھر بھی فتویٰ دیانت پر نہیں بلکہ قضا پر بھی دیا جاتا ہے، اس کی وجہ سوائے فسادِ زمانہ کے اور کوئی نہیں کہ دیانت کا پست معیار اور اہل زمانہ کے احوال مفتی کو قضا کی سرحد میں قدم رکھنے پر مجبور کرتے ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ اگر شوہر کی نیت پر مدار رکھا جائے اور اسے اس بارے میں امین تصور کیا جائے تو پھر یہ اصول وسعت چاہے گا اور معاملہ صرف دلالت تک محدود نہیں رہے گا، بلکہ علت کے اشتراک کی وجہ سے بہت مسائل میں شوہر کی نیت

کا اعتبار کرنا ہوگا۔

دلالتِ حال کی تائید وتردید اور حمایت ومخالفت اور اس ضمن میں سلطنت عثمانیہ اور برادر اسلامی ممالک میں رائج قوانین کے تذکرے سے مقصد یہ تھا کہ ہمارے دیار میں بھی اگر دلالت کو نیت کے قائم مقام قرار دینے میں کوئی تنگی اور دشواری ہے اور اہل علم کی جماعت خلوص کے ساتھ سمجھتی ہے کہ کسی دیگر مذہب میں یسر وسہولت اور مصالح شرعیہ کا احیاء ہے تو حالات ومقتضیات کی رعایت رکھتے ہوئے کسی دوسرے مذہب کو اختیار کیا جاسکتا ہے۔ اس سلسلے میں گفتگو کا محور اور دلائل کا موضوع صرف یہی ایک امر ہونا چاہیے کہ ہمارے ہاں دلالتِ حال کا اعتبار کسی مصلحت شرعی کے فوت کا باعث بن رہا ہے یا نہیں؟ حصر کے ساتھ گفتگو کو اس نقطے میں مرکوز کرنے کی وجہ یہ ہے کہ آج کل بعض اہل قلم ائمہ اربعہ کے درمیان بھی محاکمہ کرنے چل پڑتے ہیں اور اپنے فہم میں دلائل کی بنا پر ایک امام کے قول کو دوسرے پر ترجیح دینے لگتے ہیں، اگر یہ رسم عام ہوگئی تو پھر مذہب کے بنیادی ستون بھی محفوظ نہیں رہیں گے۔

فائدہ ۱۷
عُرف

سترہواں فائدہ

عُرف

یہ فائدہ عرف کے متعلق ہے جو بیان میں سب سے مؤخر ہے، مگر اہمیت میں سب سے مقدم ہے۔ اُسے پہلے اور نمایاں ذکر کرنا چاہیے تھا، مگر اس کی حیثیت خلاصہ اور اختتامیہ کی ہے، اس لیے اسے اختتام ہی میں ذکر کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ ذیل میں چند ایسے چیدہ چیدہ امور ذکر کیے جاتے ہیں، جس سے عرف کی اہمیت و وقعت کا اندازہ ہو جاتا ہے۔

۱:......طلاق کے معاملے میں جو الفاظ قرآن وحدیث میں وارد ہوئے ہیں، وہ وہی ہیں جو نزولِ قرآن کے وقت عرب معاشرے میں اس مقصد کے لیے رائج تھے۔ زمانۂ جاہلیت میں طلاق کے علاوہ ایلاء اور ظہار کے ذریعے بھی رسم طلاق ادا کی جاتی تھی اور اس سلسلے میں شوہر کے اختیارِ طلاق پر کوئی قدغن عائد تھی نہ ہی طلاق کا جواز کسی خاص صیغہ پر موقوف تھا، بلکہ ایک کنایہ لفظ کہہ دینا بھی صحت طلاق کے لیے کافی سمجھا جاتا تھا۔ اسلام نے تو طلاق کی گرہ مرد کے ہاتھ میں رکھی ہے اور وہی اُسے کھول سکتا ہے، مگر اس وقت کے روشن خیالوں نے گرہ کشائی کا یہ اختیار عورت کو بھی تفویض کر دیا تھا اور وہ ایک خاص فعل انجام دے کر مثلاً دروازے کا رخ بدل کر شوہر کو طلاق دی سکتی تھی، گویا فعل کے ذریعے ایقاعِ طلاق کوئی جدید تصور نہیں بلکہ جاہلی ذہن کی پیداوار ہے۔

بہرحال شیوع اسلام سے قبل بھی رسمِ طلاق جاری تھی اور مختلف طریقوں سے ادا کی جاتی تھی اور جاہلی ذہن نے اُسے بے شمار مفاسد کا مجموعہ بنا دیا تھا۔ ظاہر ہے کہ جب طلاق تھی تو اس مقصد کے لیے استعمال ہونے والے الفاظ بھی تھے اور شریعت ان ہی کی زبان میں اتری ہے، اس لیے طلاق کے لیے جو الفاظ کتاب وسنت میں وارد ہوئے ہیں، وہ وہی ہیں جو اس وقت کے عرب معاشرے میں رائج تھے۔ یہی الفاظ جو قرآن وسنت میں مذکور ہیں، وہی فقہ کی کتابوں میں منقول چلے آرہے ہیں۔ اس طرح طلاق کے الفاظ کا ماخذ کتب فقہ ہیں اور کتب فقہ کا ماخذ کتاب وسنت اور کتاب وسنت کا ماخذ اس زمانے کی زبان، عرف اور معاشرہ ہیں۔

۲:......قرآن مجید میں طلاق کے بیان کے لیے ''طلاق''، ''فراق'' اور'' سراح'' وغیرہ کے الفاظ آئے ہیں، جب کہ احادیث وآثار میں ''بتة، بتلة'' وغیرہ الفاظ وارد ہیں۔ مصنفات میں معمولی تلاش سے پندرہ بیس کے قریب الفاظ دستیاب ہوجاتے ہیں۔ فقہاء نے ان الفاظ کو نقل کیا ہے اور اس کے ساتھ جو الفاظ ان کی مقامی زبانوں میں طلاق کا مفہوم رکھتے تھے وہ بھی درج کر لیے ہیں اور ساتھ ہی اپنے زمانے کے عرف کو مدنظر رکھتے ہوئے ان الفاظ کی نوعیت اور حیثیت بھی متعین کر دی ہے، مثلاً: جو الفاظ طلاق ہی کے لیے مروج ومستعمل تھے انہیں صریح قرار دیا اور جو طلاق کے علاوہ دوسرا مفہوم بھی رکھتے تھے اور ان کا غالب استعمال طلاق کے لیے نہ تھا، ایسے الفاظ کو کنایہ کی فہرست میں شمار کرلیا ہے۔ اس طرح پچھلے زمانے کے الفاظ جمع اور محفوظ ہوتے رہے اور نئے الفاظ اس میں اضافہ اور زیادہ ہوتے رہے۔ اب صورت حال یہ ہے کہ کتب فقہ وفتاویٰ میں الفاظِ طلاق کا ایک بڑا ذخیرہ جمع ہوگیا ہے جو عربی، فارسی اور اردو الفاظ پر مشتمل ہے، مگر چونکہ یہ الفاظ نہ تو ایک زمانے کے ہیں اور نہ ہی ایک زبان کے ہیں، بلکہ مختلف زمانوں اور زبانوں کے ہیں، اس لیے صرف کتب فقہ میں کسی لفظ کا مذکور ہونا اس کے طلاق کا لفظ ہونے کے لیے کافی نہیں، بلکہ متکلم کی زبان اور عرف کی رعایت ضروری ہے۔ لفظ حرام

کے متعلق دیکھ لیجیے کہ کسی زمانہ میں کنایہ تھا، مگر اب صریح سمجھا جاتا ہے۔

فقہاء نے صراحت کردی ہے کہ جو لفظ کسی زبان میں کنایہ ہے اس کا حکم عربی کنایہ کا اور جو صریح ہے اس کا حکم عربی کے صریح کا ہے۔ اس اصول کا منشا یہی ہے کہ عربی الفاظ متکلم پر لاگو اور نافذ نہیں ہیں، بلکہ وہ رہنمائی اور رہبری کے واسطے درج ہیں اور ان سے مدد لے کر مقامی لفظ کے متعلق ہدایت اور رہنمائی حاصل کی جا سکتی ہے، مثلاً: شوہر نے جو لفظ استعمال کیا ہے وہ اس کی زبان میں کنایہ ہے اور عربی میں کنایہ سے وقوعِ طلاق نیت یا دلالت سے مشروط ہوتا ہے، اس لیے اس مقامی لفظ سے طلاق کا وقوع بھی نیت یا دلالت سے مشروط ہوگا۔ زیادہ واضح الفاظ میں ''نکل جاؤ'' کا حکم وہی ہے جو ''اخرجی'' کا ہے۔

۳:......طلاق کے الفاظ میں سے کچھ صریح ہیں اور کچھ صریح سے ملحق ہیں اور کچھ کنایہ ہیں۔ یہ تقسیم عرف کے پیش نظر ہے، کیوں کہ صریح اور کنایہ ہونے کا مدار معنی کے صاف اور واضح ہونے یا خفی اور پوشیدہ ہونے پر نہیں، بلکہ استعمال اور عدم استعمال پر ہے۔ کسی لفظ کا معنی کتنا ہی واضح اور روشن کیوں نہ ہو، مگر جب وہ طلاق کے علاوہ بھی استعمال ہوتا ہے تو وہ کنایہ ہے اور ایک لفظ جس کا معنی پوشیدہ اور مبہم ہے، مگر اس کا عام استعمال طلاق کے لیے ہوتا ہے تو وہ صریح ہے۔ الغرض مدار اور معیار عرف ہے اور اسی کی وجہ سے صریح اور کنایہ کی تقسیم بھی ہے اور اسی کی وجہ سے فقہاء کے نزدیک ان دونوں کی تعریف اصولیین کی تعریف سے مختلف ہے۔

اگر درج بالا اصول تسلیم ہے اور انکار کی کوئی وجہ نہیں تو اس سے خود بخود یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ محض وضع کی وجہ سے کوئی لفظ صریح نہیں بن سکتا جب تک وضع کے ساتھ عرف ہم آہنگ نہ ہو اور جب عرف وضع سے جدا ہوتا ہے تو صریح کی صراحت بھی ختم ہو جاتی ہے اور وہ پھر کنایہ کے مقام پر آ جاتا ہے۔

اس بحث سے لغت میں عرف کا عمل دخل سمجھ میں آجاتا ہے کہ وہ کس طرح لغت پر اثر انداز ہوتا ہے۔ ایک لفظ کا لغوی مفہوم طلاق کا ہے مگر وہ پھر بھی نیت کا محتاج ہے، مگر جب وہ عرف کی وجہ سے صریح بن گیا تو اب نیت کی احتیاج نہ رہی اور اس سے بلا نیت بھی طلاق واقع ہے۔

۴:......جس طرح صریح اور کنایہ کا مدار عرف پر ہے، اسی طرح صریح کے کنایہ بننے اور کنایہ کے صریح ہوجانے کا مدار بھی عرف پر ہے۔ یہ عرف ہی ہے جو صریح کو کنایہ اور کنایہ کو صریح بنادیتا ہے۔

جب صریح کنایہ بن سکتا ہے اور کنایہ صریح ہوسکتا ہے تو یہ ضروری نہیں ہے کہ صریح ہمیشہ صریح اور کنایہ ہمیشہ کنایہ ہی رہے۔ طلاق کے معاملے میں کسی لفظ کو ابدی، دائمی، قطعی، ازلی اور حتمی حیثیت حاصل نہیں ہے۔ پچھلوں کا عرف ہمارے لیے اور ہمارا عرف بعد والوں کے لیے حجت نہیں ہے۔ اس بنا پر کسی لفظ کی نوعیت متعین کرتے وقت سوال ''کیا تھا؟'' کا نہیں بلکہ ''کیا ہے؟'' کا ہوگا۔ فقہاء بہت پہلے وضاحت فرما گئے ہیں کہ معاشرے کے دیگر احوال کی طرح عرف بھی بدلتا رہتا ہے، اور جب عرف بدلتا ہے تو اس کے ساتھ حکم کی تبدیلی بھی ناگزیر ہوجاتی ہے: ''**لا ینکر تغیر الأحکام بتغیر الأزمان**'' مشہور قاعدہ ہے۔ جب مدار عرف پر ہے اور عرف ہر جگہ اور ہر زمانے میں یکساں نہیں رہتا تو صرف اس قدر جان لینا کافی نہ ہوگا کہ کوئی لفظ طلاق کے لیے سمجھا جاتا تھا، بلکہ موجودہ عرف کی تحقیق ضروری ہوگی، لہٰذا کسی قدیم کتاب میں کوئی لفظ الفاظِ طلاق کی فہرست میں درج ہو، مگر اب وہ لفظ طلاق کا مفہوم ہی نہ رکھتا ہو تو وہ طلاق کا لفظ ہی نہیں ہے، اور اگر کوئی لفظ کسی زمانے میں طلاق ہی کے لیے استعمال ہوتا تھا، مگر اب اس سے طلاق دینے کا عام عرف نہ ہو تو وہ صریح نہ سمجھا جائے گا اور جس کا استعمال طلاق اور غیر طلاق دونوں کے لیے تھا، مگر اب اس کا غالب استعمال طلاق کے لیے ہے تو وہ کنایہ نہیں، بلکہ صریح کہلائے گا۔

۵:......جس طرح یہ ممکن ہے کہ ایک لفظ ایک زمانے میں طلاق کے لیے ہو، مگر دوسرے زمانے میں وہ طلاق کے لیے نہ ہو، اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ ایک لفظ ایک برادری کے ہاں طلاق کے لیے ہو، مگر کسی دوسری قوم یا کمیونٹی میں وہ طلاق کے لیے نہ سمجھا جاتا ہو۔ یہ بھی ممکن ہے بلکہ امر واقعہ ہے کہ ایک لفظ ایک قوم کے ہاں کنایہ اور دوسری کے عرف میں وہ صریح ہو۔ اس بنا پر ایک ہی زمانہ میں ایک قوم کا عرف دوسری قوم پر حجت نہیں ہوسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک ہی لفظ کے متعلق مفتیان کرام کا جواب مختلف ہوتا ہے۔ ایک قوم یا علاقے والوں سے تو کسی لفظ کے متعلق نیت دریافت کی جاتی ہے مگر دوسری قوم اور برادری والوں سے یہ ضرورت محسوس نہیں کی جاتی، وجہ وہی عرف کا فرق ہوتا ہے، مثال کے طور پر خیبر پختون خوا کے بعض علاقوں میں جب شوہر بیوی کو کہتا ہے کہ تو مجھ پر ماں بہن ہے تو نیت دریافت کیے بغیر طلاق بائن کا فتویٰ دیا جاتا ہے، مگر جہاں کا عرف اس لفظ سے طلاق کا نہ ہو وہاں نیت معلوم کی جاتی ہے۔

۶:......عرف کی اہمیت اس قدر ہے کہ کوئی لفظ جو شرعاً طلاق کے لیے موضوع ہو، مگر کسی قوم کی زبان میں وہ طلاق کے لیے نہ ہو تو صرف اس بنا پر اس سے طلاق واقع نہیں سمجھی جائے گی کہ شرعاً وہ لفظ طلاق کے لیے موضوع ہے۔ فرض کیجئے ایک قوم ایسی ہے جن کی زبان میں طلاق کا لفظ رشتۂ زوجیت کو ختم کرنے کے لیے نہیں، بلکہ اسے مزید مضبوط اور مستحکم کرنے کے لیے استعمال ہوتا ہے تو اس قوم کے ہاں لفظ طلاق سے بھی طلاق واقع نہ ہوگی، اگرچہ یہ لفظ قرآن وحدیث میں اسی مقصد کے لیے وارد ہے اور طلاق کے بارے میں صریح نہیں بلکہ "أصرحُ صریح" ہے۔ "کلمہ "اُفّ" اس کی نظیر ہے کہ جن لوگوں کے عرف میں یہ کلمہ ایذا رسانی کا کلمہ نہ ہو، بلکہ اعزاز واکرام کے لیے استعمال ہوتا ہو تو ان کی بول چال میں یہ لفظ والدین کو کہنے میں کوئی حرج نہیں ہوگا۔ یہی حال اَیمان (قسموں) کا ہے کہ اس کا مدار بھی چونکہ عرف پر ہے، اس لیے جب عرف اور لغت کا اختلاف ہوتا ہے تو برتری عرف کو ہی حاصل ہوتی ہے۔

۷:......لفظِ طلاق کا اثر اور نتیجہ کیا ہوگا، اس سے رجعی واقع ہوگی یا بائن؟ اس کا تعین ایک تو معنی کی شدت اور خفت سے ہوتا ہے، مثلاً: جس لفظ میں شدت اور سختی ہو اور معلوم ہوتا ہو کہ شوہر رشتے کو فوری طور پر ختم کرنا چاہتا ہے، اس سے بائن واقع ہوگی۔ دوسرا عامل عرف ہے، فقہاء رجعی یا بائن کا فیصلہ کرتے وقت عرف کو بطور علت کے پیش کرتے ہیں۔ جن فقہاء کے نزدیک صریح سے رجعی ہی واقع ہونی چاہیے، ان کی اس دلیل کی بنیاد پر تو یہ کہنا بھی درست ہے کہ عرف کی بنا پر ہی رجعی واقع ہوتی ہے، کیوں کہ رجعی طلاق صریح سے ہوتی ہے اور صریح عرف کی وجہ سے صریح ہوتا ہے تو رجعی بھی عرف کی وجہ سے ہوتی ہے، البتہ اس دلیل میں اس پہلو سے تامل معلوم ہوتا ہے، بعض کنایہ الفاظ ہیں مگر ان سے رجعی واقع ہوتی ہے۔

۸:......مضارع کے صیغے سے طلاق نہیں ہوتی مگر جب عرف میں اس کا اکثر استعمال زمانہ حال کے لیے ہو تو اس سے طلاق واقع ہوجاتی ہے۔

۹:......عرف چند اور شرائط کی بھی تکمیل کرتا ہے، مثلاً: طلاق کی اضافت بیوی کی جانب ضروری ہے، مگر کوئی لفظ عرف میں طلاق کے لیے مخصوص ہوگیا ہو تو اضافت ضروری نہیں رہتی ہے، جیسے ''**الطلاق یلزمنی**'' اور ''**الحرام یلزمنی**'' وغیرہ الفاظ کے متعلق اضافت کے بیان میں تفصیل گزر چکی ہے۔

۱۰:......کنایہ سے طلاق اس وقت واقع ہوتی ہے جب متکلم اپنی نیت کا اظہار کردے یا قرائن سے اس کی نیت معلوم ہوجائے، مگر جب کنایہ کا عمومی استعمال طلاق کے لیے ہونے لگے تو پھر نیت کی ضرورت نہیں رہتی، عرف ہی نیت کے قائم مقام ہوجاتا ہے۔

۱۱:......شوہر نے تین مرتبہ طلاق کا لفظ دہرایا اور اپنی نیت تاکید کی بیان کرتا ہے اور عرف سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے تو فتویٰ اس کی نیت کے مطابق دیا جائے گا۔

خلاصہ مباحث گزشتہ

آج کی اس الوداعی مجلس میں مقصود گزشتہ مباحث کا سرسری اور عمومی نوعیت کا جائزہ ہے تا کہ اس ضمن میں تمام تحریر کا نچوڑ اور لب لباب بھی سامنے آجائے اور یہ بھی واضح ہو جائے کہ تعبیر و تشریح کے اصولوں کی عملی افادیت کیا ہے اور یہ کہ کس موقع پر کون سا متعلقہ ہے اور اسے کس انداز سے بروئے کار لانا چاہیے۔

لفظ کا انفرادی جائزہ

۱:......(الف):......طلاق کا تعلق لفظ کے ساتھ ہے اور یہ بالکل بدیہی ہے کہ لفظ کے جائزے کے لیے لفظ کا ہونا ضروری ہے۔ اس لیے پہلا اصول تو یہی ہے کہ شوہر نے کوئی لفظ استعمال کیا ہو۔

(ب):......مگر مطلق لفظ کا استعمال کافی نہیں بلکہ ایسا لفظ ہونا چاہیے جو طلاق کا مفہوم رکھتا ہو کیونکہ اگر کوئی لفظ طلاق کا مفہوم نہ رکھتا ہو تو قصد و ارادہ سے بھی اس میں طلاق کا معنی پیدا نہیں کیا جا سکتا۔

(ج):......لفظ اگر طلاق کا مفہوم رکھتا ہو تو پھر سب سے پہلے اس کی نوعیت متعین کرنا ضروری ہے کہ صریح ہے یا کنایہ ہے یا صریح سے ملحق ہے؟ کیونکہ طلاق کے

تمام الفاظ ان ہی تین انواع میں منحصر ہیں اور یہ ممکن نہیں کہ کوئی لفظ ان میں سے کسی قسم میں داخل نہ ہو۔

نوعیت کی تعیین اور حکم

۱:......(**الف**):...... ان تینوں میں سے کسی نوع کو متعین کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اگر لفظ ایسا ہے کہ اس کا عام استعمال طلاق کے مقصد سے ہوتا ہے تو وہ صریح ہے۔ صریح کا حکم یہ ہے کہ اس کے استعمال سے شوہر نے خود ہی کھلے اور صاف لفظوں میں کہہ دیا ہے کہ میں نے طلاق دے دی ہے، اب اس کی نیت کا سراغ لگانے اور منشا دریافت کرنے کی ضرورت نہیں، اس نے خود ہی اپنا منشا بیان اور اپنی نیت کا اظہار کر دیا ہے اور متکلم سے بڑھ کر کوئی اس کی نیت کا ترجمان اور اقوال کا شارح نہیں ہوسکتا۔

صریح کی پہچان متکلم کے عرف سے ہوتی ہے، اس لیے ہوسکتا ہے کہ کوئی لفظ اصلا کنایہ ہو مگر شوہر کے عرف میں صریح ہو۔ صریح ہونے کا مدار کتابوں پر یا یا لفظ کے معنی پر کہ وہ صاف ہے یا پوشیدہ، اس میں شدت ہے یا خفت یا کسی اور قوم یا برادری کے عرف پر نہیں بلکہ شوہر کے عرف پر ہے۔ اگر کوئی لفظ اس معیار پر صریح ہے تو:

۱:......شوہر کی نیت طلاق کی ہوگی۔

۲:...... یا کچھ نیت نہ ہوگی۔

۳:...... یا طلاق کے علاوہ کچھ اور نیت ہوگی۔

پہلی دو صورتوں میں طلاق واقع ہے لیکن تیسری صورت میں معاملہ قضا اور دیانت میں چلا جاتا ہے۔ صاحب بحر کے نزدیک تو دیانۃ صریح بھی نیت کا محتاج ہوتا ہے، جب کہ علامہ شامی نے اس کی تردید کی ہے اور لکھا ہے کہ جن جزئیات میں صریح

سے دیانۃ عدم وقوع کا ذکر ہے وہاں کوئی شرط مفقود ہوتی ہے مثلاً شوہر نے لفظ کا قصد نہیں کیا ہوتا ہے یا وہ لفظ کا مطلب نہیں جانتا یا سبقت لسانی سے لفظ اس سے صادر ہوجاتا ہے یا وہ بیوی کی طرف طلاق کی اضافت نہیں کرتا یا لفظ کے اندر کوئی معقول تاویل کرتا ہے وغیرہ۔

جن صورتوں میں کسی شرط کے مفقود ہونے کی وجہ سے صریح سے ازروئے دیانت طلاق واقع نہ ہو، ان صورتوں میں اگر کوئی ظاہری قرینہ بھی ایسا موجود ہو جو عدم طلاق پر دلالت کرتا ہو تو قضاءً بھی شوہر کے قول کا اعتبار ہوگا۔

(ب):......اگر لفظ صریح نہ ہو تو پھر ملحق بالصریح ہوسکتا ہے یعنی اصل میں تو کنایہ ہے مگر اس کا بکثرت استعمال طلاق کے لیے ہوتا ہے۔صریح کی طرح ملحق بالصریح میں بھی نیت کی ضرورت نہیں ہوتی مگر چونکہ ملحق بالصریح صرف نیت کی ضرورت نہ ہونے میں صریح کا حکم رکھتا ہے، بقیہ احکام میں اپنے اصل پر ہے اس لیے بقیہ احکام میں کنایہ کے اصولوں کو مدنظر رکھ اس کی تعبیر وتشریح کرنی چاہیے۔

ملحق بالصریح اگرچہ مثل صریح ہے مگر اس سے طلاق کا وقوع اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ کوئی ایسا لفظی یا معنوی قرینہ موجود نہ ہو جو طلاق کے عدم وقوع پر دلالت کرتا ہو، مثلاً: تم آزاد ہو جو چاہو پہنو، جو چاہو پہنو، عدم وقوع طلاق کا قرینہ ہے، اس لیے طلاق واقع نہیں اور جب ملحق بالصریح میں یہ شرط ہے تو کنایات میں بطریق اولی یہ شرط عائد ہوگی بلکہ اگر لوگوں کے عرف اور محاورے کو دیکھا جائے تو لفظ طلاق کے علاوہ شاید ہی کوئی ایسا لفظ ہوگا جو بلا قرینہ حالیہ یا مقالیہ طلاق کے لیے استعمال ہوتا ہو۔اگر قرینے کی موجودگی کو بطور شرط لازم ٹھہرانے میں مبالغہ محسوس ہو تو منفی قرینے کی عدم موجودگی کو شرط ٹھہرانا کوئی مبالغہ آرائی نہیں ہے۔منفی قرینے سے مراد یہ ہے کہ کوئی لفظی یا

معنوی امر ایسا موجود نہ ہو جو طلاق کی نفی کرتا ہو۔

(ج):...... گفتگو اس امر کے متعلق ہے کہ سب سے پہلے لفظ کی نوعیت متعین کرنا ضروری ہے۔ اگر لفظ صریح یا ملحق بالصریح نہ ہو تو پھر ممکن ہے کہ کنایہ ہو۔

اگر کنایہ ہے تو پھر نیت یا دلالت میں سے کسی ایک کا ہونا ضروری ہے۔ اگر شوہر اقرار کرتا ہے کہ میں نے طلاق کی نیت سے کنایہ کا استعمال کیا ہے تو لفظ کا حکم اور نتیجہ بتا دینے پر اکتفا کرنا چاہیے، لیکن اگر شوہر طلاق کی نیت کا انکار کرتا ہے تو دیکھا جائے گا کہ دلالت حال سے اس کی نیت ثابت ہوتی ہے یا نہیں؟ یہ مقام وضاحت چاہتا ہے، اس لیے تھوڑی تفصیل نامناسب معلوم نہیں ہوتی۔

کنایہ اصل وضع میں طلاق کے لیے نہیں ہوتا ہے اور اس کے حکم اور مفہوم میں طلاق کے حکم اور مفہوم سے زیادہ عموم ہوتا ہے، اس میں طلاق اور غیر طلاق کا یکساں احتمال اور مساوی امکان ہوتا ہے اور طلاق کے احتمال کو ترجیح دینے کے لیے نیت یا دلالت کی ضرورت پڑتی ہے۔ طلاق اور غیر طلاق کے احتمال کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ:

اس سے بیوی کو خطاب درست ہو۔

وہ طلاق کی خبر بننے کی صلاحیت رکھتا ہو۔

اور طلاق کو اس کے لیے سبب اور خود اسے طلاق کا مسبب قرار دینا درست ہو۔

بیوی کو باپ کہنا درست ہے نہ ہی اسے طلاق کا نتیجہ قرار دینا معقول ہے اور نہ ہی یہ توجیہ ممکن ہے کہ چونکہ شوہر طلاق دے چکا ہے اس لیے بیوی باپ بن چکی ہے۔

کنایہ کا حکم یہ ہے کہ تمام کنایہ الفاظ میں قدر مشترک کے طور پر طلاق کا معنی پایا جاتا ہے، اس لیے نیت ہو تو کنایہ کے ہر قسم سے طلاق ہو سکتی ہے، مگر کنایہ میں طلاق کے

معنی یہ ہے کہ اس میں جواب بننے کی صلاحیت ہو اور جواب کی صلاحیت سے مراد یہ ہے کہ شوہر نے مطالبہ طلاق پر طلاق دے دی ہے اور اس کی پہچان کا ضابطہ یہ ہے کہ اس سے طلاق کا نتیجہ یعنی حریت اور بینونت وغیرہ خود بخود ثابت ہو جاتی ہو اور اس نتیجے کو وجود میں لانے کے لیے کسی با اختیار شخص کے واسطے کی ضرورت نہ ہو، جب کہ غیر طلاق سے مراد یہ ہے کہ اس میں سب وشتم کا یا رد کا یعنی مطالبہ کو مسترد کرنے کا امکان ہو۔

کنایہ میں اگر شوہر طلاق کی نیت کا انکار کرتا ہے تو اس کا موقف کوئی ایسا خلاف حقیقت بھی نہیں کیونکہ لفظ میں طلاق کے علاوہ معنی کی بھی گنجائش ہے، مگر عدالت دیکھے گی کہ دلالت حال سے بھی اس کے موقف کی تائید ہوتی ہے یا نہیں؟ شوہر کی نیت کو جانچنے کا پیمانہ یہ ہوگا کہ اگر اس نے معتدل اور پرسکون ماحول میں کنایہ کا استعمال کیا ہے تو اس کا بیان قابل قبول ہے کیونکہ کسی خارجی قرینے کی عدم موجودگی کی وجہ سے مدلل طور پر شوہر کی نیت کو جھٹلانا ممکن نہیں ہے البتہ غصہ کی حالت جذبات اور عقل میں جنگ کی حالت ہوتی ہے اور یہ دونوں جب مقابل ہوتے ہیں تو جذبہ غالب اور عقل مغلوب ہو جاتی ہے، بڑے بڑے عقلاء بھی دونوں کے تصادم کے وقت جذبے کا شکار ہو جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جذبات کی بے اعتدالی کے وقت شریعت نے کوئی اہم فیصلہ کرنے کی ممانعت کی ہے۔ بہرحال طبیعت کی اس بے اعتدالی کے وقت شوہر سے کوئی بھی اقدام بعید نہیں ہوتا۔ زوجین کے درمیان جب ایسا ماحول قائم ہوتا ہے تو کبھی شوہر ضد پکڑ کر اپنی بات پر جم جاتا ہے اور فریق ثانی کا کوئی مطالبہ خواہ کتنی ہی معقول اور ضروری کیوں نہ ہو، شوہر اس سے انکار کر دیتا ہے اور کبھی غیر شائستہ الفاظ کہہ کر زوجہ کی عزت نفس اور جذبات کو مجروح کرتا ہے اور کبھی طلاق کا استعمال کر کے اپنے وقتی جذبے کی تسکین کر دیتا ہے۔

شریعت ان تینوں احوال کو مدنظر رکھ کر کنایہ کا تجزیہ کرتی ہے۔ اگر کنایہ میں سب

وشتم کا احتمال ہے اور شوہر نے غیظ وغضب کے وقت اسے استعمال کیا ہے تو شریعت فرض کرے گی کہ شوہر نازیبا کلمات استعمال کر کے بیوی کی توہین وتذلیل کر رہا ہے اور بدزبانی وبدکلامی پر اتر آیا ہے۔ اگر اس کے الفاظ میں مطالبہ کی نامنظوری اور عدم قبول وتسلیم کا معنی ہو تو پھر یوں قرار دے دیا جاتا ہے کہ شوہر نے طلاق کا مطالبہ مسترد کر کے بیوی کو جھڑک دیا ہے۔ اگر لفظ میں طلاق ہی طلاق کا معنی ہے تو پھر شوہر کا انکار بے معنی ہے کیونکہ لفظ طلاق کا ہے اور ماحول پورا کا پورا اس کی تائید کرتا ہے۔

حالت مذاکرہ میں اگر شوہر نے صرف جواب کی صلاحیت رکھنے والا لفظ استعمال کیا ہے تو شوہر سے نیت پوچھنے کی ضرورت نہیں کیونکہ طلاق مانگنے پر طلاق دینا کوئی غیر معقول نہیں ہے۔ کنایات کی اس تشریح سے جو امر دو اور دو چار کی طرح واضح ہے وہ یہ ہے کہ شریعت محض الفاظ کو نہیں دیکھتی بلکہ اس ماحول کو سامنے رکھ کر شوہر کے الفاظ سمجھنے کی کوشش کرتی ہے اور جہاں لفظ اور ماحول موافقت ہو وہاں شوہر کے کہے کا اعتبار کر لیتی ہے اور جہاں دونوں میں تضاد سامنے آتا ہو وہاں لفظ کو معیار ومدار قرار دے کر اس پر فیصلہ کر دیتی ہے۔ ایسا بالکل معقول اور انصاف کے تقاضوں کے عین مطابق ہے۔

(د):...... جیسا کہ ذکر ہوا کہ کنایہ سے طلاق کا وقوع نیت یا دلالت کی وجہ سے ہوتا ہے۔ اگر تمام اسباب طلاق کا استیعاب کیا جائے تو احناف کے نزدیک طلاق کا وقوع صریح سے یا ملحق بالصریح سے یا کنایہ سے ہوتا ہے اور کنایہ میں نیت یا دلالت شرط ہوتی ہے۔ گویا چار میں سے ایک چیز کا وجود ضروری ہے لیکن یہ چار در حقیقت تین چیزیں ہیں کیونکہ ملحق بالصریح بھی صریح ہی ہے اور اگر ان تینوں کو مزید سمیٹا جائے تو صرف صریح یا نیت سے طلاق ہوتی ہے کیونکہ دلالت کی شرط بھی نیت کا کھوج لگانے کے لیے ہے بلکہ اگر یوں کہا جائے کہ تو بھی بے جا نہ ہوگا کہ صرف نیت سے طلاق ہوتی ہے کیونکہ صریح میں عرف نیت کے قائم مقام ہو جاتا ہے اور صریح کا تکلم کرنے والا عرفاً نیت کرنے والا کہلاتا ہے۔ لہذا بطور حاصل کہا جا سکتا ہے کہ:

طلاق نیت سے ہوتی ہے خواہ:

۱:......نیت عرف سے ثابت ہو

۲:......شوہر کے اظہار سے ثابت ہو

۳:...... یا دلالت سے ثابت سے ہو

اس تعبیر کے مطابق نیت اصل ہے اور عرف اور دلالت، نیت کے ثبوت کے ذرائع ہیں۔ واللہ اعلم

۴:......(الف):......نوعیت کی تعیین کے وقت یہ امر بھی زیر غور لانا چاہیے کہ شوہر نے کس زمانہ کا صیغہ استعمال کیا ہے۔ اگر الفاظ مستقبل کے ہیں تو وہ ڈراوا اور دھمکی ہیں اور اگر حال کا صیغہ ہے تو ضروری ہے کہ وہ استقبال کے معنی میں نہ ہو اور اگر مضارع ہے تو اس کا غالب استعمال زمانہ حال میں ہونا چاہیے۔

(ب):......بعض اوقات صیغہ زمانہ حال کا ہوتا ہے مگر شوہر اسے کسی شرط کے ساتھ مشروط کر دیتا ہے یا زمانہ آیندہ تک اس کا نفاذ موقوف کر دیتا ہے، اگر ایسا ہے تو شرط کے وقوع اور متعلقہ وقت کے آمد پر ہی طلاق واقع ہوگی۔ معلق اور مضاف طلاق کے بارے میں زیادہ تفصیل کی حاجت نہیں معلوم ہوتی مگر اضافت کا مسئلہ ضرور تنبیہ اور وضاحت چاہتا ہے۔

طلاق کے وقوع کے لیے نیت یا اضافت میں کسی ایک کا ہونا ضروری ہے اور اضافت صریح یا معنوی ہوسکتی ہے، اگر اضافت صریح ہو تو نیت کی بھی ضرورت نہیں اور دیانۃ وقضاء دونوں طرح طلاق واقع ہے۔ جو تعبیر اپنی بیوی کو طلاق دینے کے لیے معروف ہو وہ صریح اضافت کے حکم میں ہے اور اس سے بلا نیت طلاق ہو جاتی ہے،

الطلاق یلزمنی والحرام یلزمنی وغیرہ اسی نوع کی مثالیں ہیں، شوہر کا کلام سوال کے جواب میں ہو اور سوال میں اضافت ہو تو جواب میں بھی اضافت متحقق ہو جاتی ہے۔ کتب فقہ میں جن جزئیات میں عدم وقوع طلاق مذکور ہے ان میں صریح اضافت کے فقدان کے ساتھ نیت اور عرف بھی مفقود ہوتے ہیں۔

طلاق کا ثمرہ ونتیجہ

۵:......نوعیت کی تعیین کے بعد اگلا حل طلب سوال یہ ہوتا ہے کہ اس لفظ سے کون سی طلاق واقع ہے؟ کیونکہ ضروری نہیں کہ صریح سے رجعی اور کنایہ سے بائن واقع ہو بلکہ معاملہ اس کے برعکس بھی ہوسکتا ہے۔ صریح سے عام طور پر رجعی اور کنایہ سے اکثر وبیشتر بائن اور ملحق بالصریح سے بعض فقہاء کے خیال کے مطابق رجعی واقع ہونی چاہیے، کچھ کے نزدیک مدار عرف پر ہے اور بعض کی تحقیق یہ ہے کہ لفظ کے عرفی استعمال کو تو نیت کے قائم مقام قرار دیا جاسکتا ہے مگر رجعی یا بائن کا فیصلہ لفظ کے مقتضیٰ کے مطابق ہونا چاہیے، چنانچہ اگر لفظ فوری طور پر قید نکاح کے زوال کا تقاضا کرتا ہے تو وہ بائن ہے بصورت دیگر رجعی ہے۔

۶:......جیسا کہ ذکر ہوا کہ صریح سے بائن بھی واقع ہو جاتی ہے اور بائن کا مدار علی اختلاف الاقوال عرف یا معنی کی شدت وخفت پر ہے مگر بعض صورتیں ایسی ہیں کہ لفظ کے معنی یا عرفی استعمال کی وجہ سے نہیں بلکہ بعض اور وجوہات کی بنا پر صریح سے بائن ہی واقع ہوتی ہے۔ ساتویں فائدہ کے تحت ایسی نو صورتیں مذکور ہوئی تھیں اور ان پر اس دسویں صورت کا اضافہ بھی ممکن ہے کہ اگر صریح سے پہلے یا بعد میں بائن طلاق بھی ہو تو صریح، رجعی ہی کیوں نہ ہو اس سے بائن ہی واقع ہوگی کیونکہ بائن طلاق رجعی کو بھی بائن بنا دیتی ہے۔

سیاق وسباق پر نظر

۷:......لفظ کی نوعیت اور اس کا ثمرہ ونتیجہ کسی لفظ کا انفرادی حیثیت سے جائزہ لے کر متعین کیا جا سکتا ہے مگر الفاظ طلاق میں سے کسی لفظ کے حکم کا بیان اس کے ماقبل اور مابعد سے صرف نظر کرتے ہوئے ممکن نہیں، کیونکہ الفاظ ایک دوسرے کے معنی ومفہوم پر اثر انداز ہوتے ہیں اور ایک دوسرے کی نوعیت میں تبدیلی یا حکم کی تنسیخ کا باعث بنتے ہیں، بایں وجہ شوہر کی پوری گفتگو کو زیر غور لانا ضروری ہے۔

مثلاً اگر شوہر نے صریح کے بعد کنایہ استعمال کیا ہے جیسے تمہیں طلاق ہے اور اب تم آزاد ہو، اور کنایہ سے اس کی نیت مستقل طلاق دینے کی ہے تو دو طلاقیں واقع ہیں لیکن اگر اس نے اپنے منشا کے اظہار کے لیے بطور تفسیر کنایہ استعمال کیا ہے تو ایک ہی طلاق واقع ہے اور اگر کنایہ کے استعمال سے اس کی کچھ نیت نہ ہو تو ایک رائے یہ ہے کہ دو طلاقیں واقع ہیں، مگر ہمارے عرف کے پیش نظر زیادہ راجح یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک ہی طلاق واقع ہے البتہ کنایہ الفاظ سے بسا اوقات صریح کی نوعیت ضرور بدل جاتی ہے جیسے تجھے طلاق دے کر آزاد کرتا ہوں، کہنے سے شوہر نے رجعی طلاق میں شدت پیدا کر دی ہے جس سے وہ بائن بن گئی ہے، مگر طلاق ایک ہی واقع ہے۔

۸:......تاکید کی وجہ سے بھی بسا اوقات طلاق کا لفظ بے اثر رہ جاتا ہے۔ اگر شوہر لفظ طلاق کا تکرار کرتا ہے اور تکرار سے مستقل طلاق کا اقرار کرتا ہے تو اس کی نیت کے مطابق طلاقیں واقع ہیں۔ اگر وہ اپنی نیت تاکید کی بیان کرتا ہے اور عرف سے اس کی تائید ہوتی ہے تو اس کے قول کا اعتبار کیا جائے گا اور اگر عرف سے اس کی تائید نہ ہوتی ہو تو از روئے دیانت تو اس کا قول معتبر ہے مگر قاضی اس کی تصدیق نہیں کرے گا اور اگر تاکید کی تائید یا تردید میں کوئی قرینہ نہ ہو تو تکرار کے مطابق طلاقیں واقع ہوں گی کیونکہ تاکید اصل نہیں ہے۔

۹:......تاکید کی طرح کنایات میں لفظی قرینہ کے تقدیم وتاخیر سے بھی لفظ کے مفہوم پر اثر پڑتا ہے۔ مثلاً کنایات میں قرینہ کا کنایہ سے مقدم ہونا ضروری ہے اور قرینہ سے اگر مذاکرہ طلاق ثابت ہو جائے مگر لفظ مذاکرہ طلاق میں بھی نیت کا محتاج ہو تو محض قرینے کی موجودگی کی وجہ سے اس سے طلاق واقع قرار نہیں دی جائے گی۔ تفصیل کے لیے بارھواں فائدہ ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

۱۰:......الفاظ طلاق کو دوسرے الفاظ سے جدا کرنے، ان کے صریح یا کنایہ اور بائن یا رجعی کا تعیین کرنے کے بعد اگلا مرحلہ طلاق کے عدد کا ہوتا ہے کہ کتنی طلاقیں واقع ہوئی ہیں۔ اس موقع پر لحوق اور عدم لحوق کے اصول کی ضرورت پڑتی ہے۔ آٹھویں فائدے کے تحت طلاق کی سولہ صورتوں کا بیان کیا گیا تھا اور مذکورہ مقام پر اس کا نقشہ بھی درج کر دیا گیا تھا جو بوقت ضرورت سہولت کا باعث ہو سکتا ہے۔ اس اختتامی بحث میں اس پوری بحث کا اعادہ طوالت کا باعث ہے تاہم جن دو اصولوں پر لحوق اور عدم لحوق کی بحث مبنی ہے وہ یہ ہے کہ کنایہ بائن کا کنایہ بائن سے لحوق نہیں ہوتا ہے چاہے پہلا کنایہ صریح ہو یا نہ ہو اور باقی تمام صورتوں میں لحوق ہوتا ہے اور دوسرا اصول یہ ہے کہ بائن اور رجعی جب جمع ہوتی ہیں تو دونوں بائن ہوتی ہیں یعنی بائن رجعی کو بھی بائن بنا دیتی ہے، تقدیم وتاخیر کی کوئی اہمیت نہیں خواہ کوئی سی طلاق بھی مقدم ہو۔

الحاصل! سب سے پہلے الفاظ طلاق الگ کیے جائیں۔

پھر ان کے صریح یا کنایہ ہونے کا تعین کیا جائے۔

پھر ان کے حکم کو دریافت کیا جائے۔

اور آخر میں طلاق کے عدد کا تعین کیا جائے۔

وصلی اللہ وسلم علی سیدنا ومولینا محمد وعلی آلہ وصحبہ اجمعین۔

کتابیات (عربی کتب)

۱:... اوضح المسالک إلی ألفیة ابن مالک علیہ الرحمہ جمال الدین عبداللہ بن یوسف الانصاری، الطبعةالأولی، دارالکتب العلمیة، بیروت، ۱۴۱۸ھ ، ۱۹۹۷ء

۲:...عمدة الرعایة علی شرح الوقایة، للامام عبدالحی بن عبدالحلیم اللکنوی علیہ الرحمہ، سنة الطباعة: ۲۰۰۹ء، ناشر: دارالکتب العلمیة، بیروت۔

۳:...حاشیة الطحطاوی علی الدرالمختار، العلامه السید احمد الطحطاوی، مکتبه رشیدیه کوئٹه۔

۴:...شرح منار الانوار اصول الفقه، للمولولی عبداللطیف الشهیر بابن الملک، الطبعة الأولی: ۲۰۰۴ء، ۱۴۲۴ھ، دارالکتب العلمیة، بیروت، لبنان۔

۵:...خلاصة الفتاویٰ، الشیخ طاهر بن عبدالرشید، مکتبه رشیدیه کوئٹه۔

۶:...الاشباه و النظائر، الشیخ زین الدین الشهیر بابن نجیم، مطبع: قدیمی کتب خانه۔

۷:...البحر الرائق، الشیخ زین الدین الشهیر بابن نجیم، ناشر: ایچ ایم سعید کراچی۔

۸:...حاشیة ردالمحتار علی الدر المختار، محمد امین الشهیر بابن عابدین ، الطبع الأولی: ۱۲۲۷ھ، مطبع: سعید کراچی، طبع جدید: ۱۴۰۶ھ

۹:...تنویر الأبصار مع درمختار، للشیخ شمس الدین التمرتاشی، طبع جدید: ۱۴۰۶ھ، سعید کراچی۔

۱۰:...بدائع الصنائع، الامام علاء الدین ابی بکر الکاسانی، الطبعة الأولی، سنة ۱۳۲۷ھ ، ۱۹۱۰ء، طبع جدید: ۱۴۰۰ھ، ناشر: ایچ ایم سعید کراچی۔

۱۱:...الفتاوی السراجیة، الشیخ الامام علی بن عثمان، ناشر: ایچ ایم سعید کراچی۔

۱۲:...الفتاوی البزازیة علی هامش الهندیة، الامام حافظ الدین محمد بن محمد بن شهاب ،

ناشر:قاری محمد اسماعیل، مکتبہ:ماجدیہ کوئٹہ، الطبعۃ الثانیہ:۱۴۰۳ھ، ۱۹۸۳ء۔

۱۳:...الفتاوی الھندیۃ، مولانا نظام و جماعتہ، مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ، ناشر:قاری محمد اسماعیل، الطبع الثانی:۱۴۰۳ھ

۱۴:...المحیط البرھانی، الامام برھان الدین، ادارۃ القرآن، طبع اولی:۱۴۲۴ھ، ۲۰۰۴ء

۱۵:...الاحکام الشرعیۃ فی الاحوال الشخصیۃ، محمد قدری باشا، مکتبہ دار السلام، الطبعۃ الاولی:۱۴۳۷ھ

۱۶:...تقریرات الرافعی علی حاشیۃ ابن عابدین، للعلامہ عبد القادر الرافعی الحنفی، ط:سعید کراچی۔

۱۷:...شد النطاق فیما یلحق من الطلاق، للشیخ مخدوم ھاشم، مطبع:المصطفائی، ۱۳۰۰ھ

۱۸:...فرق الزواج فی المذھب الاسلامیۃ، العلامہ الشیخ علی الخفیف، الطبع الاولی، دار الفکر العربی، مصر

۱۹:...العقد الدریۃ فی تنقیح الفتاوی الحامدیۃ، السید محمد امین الشھیر بابن عابدین، قدیمی کتب خانہ۔

۲۰:...مراقی الفلاح شرح نور الإیضاح، الامام حسن بن عمار الشرنبلالی الحنفی، میر محمد کتب خانہ، مکتبہ دار الباز مکۃ المکرمۃ، الطبعۃ الاولی، ۱۴۱۵ھ، ۱۹۹۵ء۔

۲۱:...مجلۃ الاحکام العدلیۃ، الطبعۃ الأولی:۱۴۳۲ھ، ۲۰۱۱ء، دار ابن حزم، بیروت، لبنان۔

۲۲:...الفتاوی التاتارخانیۃ، للعلامہ عالم بن العلاء الانصاری الاندرپتی، الدھلوی، ادارۃ القرآن الطبع:۱۹۹۰ء، ۱۴۱۱ھ

۲۳:...الدر المختار شرح تنویر الابصار، محمد بن علی بن محمد الملقب بعلاء الدین المعروف بالحصکفی، سعید کراچی، طبع:۱۴۰۶ھ

کتابیات (اردو کتب)

۱:......فتاویٰ عزیزی، شاہ عبدالعزیز دہلویؒ، مکتبہ سعید کراچی، طبع جدید: ۱۴۰۸ھ ، سن طبع: ۱۳۸۷ھ

۲:......کفایت المفتی، مفتی کفایت اللہ دہلویؒ، مکتبہ دارالاشاعت، طباعت: جولائی ۲۰۰۱ء، شکیل پریس کراچی

۳:......امدادالاحکام، مولانا ظفر احمد عثمانیؒ، مولانا عبدالکریمؒ، ناشر: مکتبہ دارالعلوم کراچی، طبع جدید: محرم ۱۴۳۰ھ

۴:......امدادالفتاویٰ، مولانا اشرف علی تھانویؒ، مکتبہ دارالعلوم کراچی، طبع جدید: محرم ۱۴۲۰ھ

۵:......حیات محدث کشمیری، مولانا انظر شاہ مسعودی، ادارہ تالیفات اشرفیہ ملتان

۶:......فتاوی رحیمیہ، مفتی سید عبدالرحیم لاجپوریؒ، دارالاشاعت کراچی، ط: مارچ ۲۰۰۹

۷:......فتاویٰ محمودیہ، مفتی محمود حسن گنگوہی، زیر نگرانی: دارالافتاء جامعہ فاروقیہ، ناشر: ادارہ الفاروق کراچی، مطبع القادر پرنٹنگ پریس

۸:......فتاویٰ دارالعلوم دیوبند، مفتی عزیز الرحمن عثمانیؒ، طباعت، ستمبر ۲۰۰۲ء شکیل پریس کراچی، دارالاشاعت

۹:......فتاویٰ حقانیہ، مولانا عبدالحق افغانیؒ، ناشر: جامعہ دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک، طبع ہفتم: ۱۴۳۱ھ، ۲۰۱۰

۱۰:...... ماخوذ از رجسٹر ۱۰، مفتی ولی حسن ٹونکیؒ، ۲۳ ربیع الثانی ۱۳۹۳ھ

۱۱:......فتاویٰ عثمانی، مفتی تقی عثمانی، مکتبہ معارف القرآن، کراچی، ط: احمد برادر پرنٹرز کراچی، ۲۰۱۳ء، ۱۴۳۵ھ

۱۲:......فتاوی مفتی محمود، مفتی محمودؒ، ناشر: محمد ریاض درانی، مطبع: اشتیاق اے مشتاق پریس لاہور، نومبر ۲۰۰۸ء

۱۳:......فقہ اسلامی، مفتی عبدالواحد، مکتبہ مجلس نشریات اسلام کراچی